مجلسِ ادارت

معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں ، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے ، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے ، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ___ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۵ عدد ۶ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۵ء

فہرست مضامین معارف

شذرات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے جن اسمائے حسنیٰ کا ذکر ہے ان میں حی وقیوم کی صفات بڑی اہم ہیں، ان صفتوں سے پہلے اللہ کی الوہیت کا ذکر اسلیے ہوا ہے کہ اس کا حی وقیوم ہونا اسکی الوہیت کا لازمی اقتضا ہے اور اللہ کے حی یعنی زندہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس طرح خود زندہ ہے اسی طرح اس نے ساری دنیا کو بھی زندگی عطا کی ہے، پوری کائنات کی زندگی اور حیات کا سرچشمہ وہی ہے، ہماری زندگی بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، ہم اقلیت میں ہوں یا ہمارے حالات ناساعد اور کٹھن ہوں اور ہمارا سابقہ جابر، خونخوار اور تشدد پسند لوگوں سے ہو، کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ کائنات کا اصلی حاکم و مالک حی ہے اسلیے وہ ہر چیز کو دیکھ اور سُن رہا ہے بس وہ ہم سے کبھی بے خبر نہیں رہ سکتا، اگر ہم اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں میں اسے پکاریں تو وہ ہماری پکار سُن کر ہماری مشکل کشائی کریگا، انسان کے سارے اعمال وافعال اسکی نظر میں ہیں اور ایک دن وہ انکا بدلہ دیگا، انسان کا کام یہ ہے کہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اس فکر وجستجو میں رہے کہ کون سے اعمال اسے پسند ہیں تاکہ اس کی اطاعت وہدایت کی راہ پر چل کر سعادت وکامرانی حاصل کر سکے۔

قیوم کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور سب کو قائم رکھنے اور سنبھالنے والا ہے، اس کی حکمت وتدبیر نے تمام انسانوں اور اس کارخانۂ عالم کو قائم رکھا ہے، آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز اسی کے حکم سے قائم ہے، اسلیے بظاہر کوئی کتنا ہی بے بس، بے سہارا اور مجبور ہو خدائے قیوم کی مرضی کے بغیر سارے انسان مل کر بھی اسکو نیست ونابود نہیں کر سکتے، اللہ کی قیومیت و ربوبیت نے جب انسان کی زندگی کو قائم رکھنے کیلیے ہر طرح کے اسباب ووسائل اور ذرائعِ معیشت مہیا کیے ہیں تو وہ اسکی ہدایت ورہنمائی کا سامان کرنے سے کیسے غافل رہ سکتا ہے جبکہ خدا کی ہدایت ہی پر انسانی زندگی کے قیام وبقا کا اصل انحصار ہے اور انسان کی تخلیق کی اصل غایت ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے تاکہ اس کے لیے راہ سعادت باز ہو اور وہ شقاوت وبدبختی سے محفوظ رہے، پیغمبروں کی بعثت اور ان پر احکام وشرائع آتارے جانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہو اور خدا کے مقرر کیے ہوئے نظام عدل وقسط پر قائم رہے، جو لوگ اپنی خود مختاری اور سرکشی سے خدا کے نظام عدل کو مٹانے کے درپے ہوں انکے دست تعدی کو روک کر خدا کے برگزیدہ بندے زمین کو شر وفساد سے پاک کر دیتے ہیں اور عدل وقسط کا نظام درہم برہم نہیں ہونے دیتے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر گوشہ میں ایک میزان رکھی ہے، اسلیے کائنات کی کوئی چیز نہ اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے اور نہ اپنے معین دائرے سے باہر ہوتی ہے، یہ اسکا ثبوت ہے کہ کائنات کو بنانیوالا عدل وقسط کو پسند کرتا ہے، اسلیے جس طرح دنیا کی تمام چیزیں خدا کے مقرر کردہ پیمانے سے سر مو تجاوز نہیں کرتیں اسی طرح انسان کو بھی اپنے حدود سے متجاوز نہیں ہونا چاہیے، بلکہ خدا کی میزان میں نپے تلے دائرے ہی کے اندر رہنا چاہیے ورنہ نظام عالم درہم برہم ہو جائیگا، ارشاد ربانی ہے "اللہ نے آسمان کو بلند کیا اور اس میں ایک میزان رکھی تم میزان کے معاملے میں تجاوز نہ کرو اور وزن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو" دنیا کا نظام عدل وقسط پر قائم ہونا اس کے اندر انقلاب وتغیر کا پتہ دیتا ہے، چنانچہ ایک کے بعد دوسری قوم نمودار ہوتی ہے اس طرح اللہ تعالیٰ امتحان لیتا ہے کہ انسان اپنے اختیار وقوت کا صحیح استعمال کرتا ہے یا نہیں، چنانچہ جب تک کوئی قوم مقررہ حد کے اندر اپنی قوت کا استعمال کرتی ہے اس وقت تک اللہ اسے عروج وارتقا بخشتا ہے لیکن جب وہ حدود سے تجاوز کرتی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اللہ اپنی سنت کے مطابق مہلت دینے کے بعد اسے ختم کر دیتا ہے اور اسکی جگہ پر دوسری قوم کو لا دیتا ہے۔

جن لوگوں کی نظر سے یہ حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں اور وہ اللہ کے حی وقیوم ہونے اور کائنات کے نظام عدل وقسط پر مبنی ہونے کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں، وہ اللہ کی حکمتوں، حلات کے الٹ پھیر

اور انقلاب روزگار کی حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں اس لیے صعوبتوں، دشواریوں اور حالات کی شدتوں سے گھبرا اٹھتے ہیں اور اپنے کو خطرات اور مصیبتوں میں گھرا ہوا خیال کرتے ہیں، جب کوئی چیخ پکار سنتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ انہی پر آفت آنیوالی ہے، ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آجانے سے انکے ہوش وحواس بجا نہیں رہتے اور اللہ تعالیٰ کے حی و قیوم، دنیا کا مالک وکارساز اور عادل و قائم بالقسط ہونے کا تصور انکی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، دوسروں کا کیا ذکر، خود مسلمانوں کا حال یہی ہے، انہوں نے اس بات کو فراموش کردیا کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ روش اور اسکی اطاعت وہدایت کا راستہ ترک کردینے ہی سے بدبختی اور شقاوت انکا مقدر بن گئی ہے، اگر خدا کے قانون عدل و قسط کے اندر رہ کر وہ اپنے اختیار و صلاحیت کا استعمال کرتے تو اللہ انہیں ضرور عروج واقبال عطا کرتا مگر جب خدا کے حدود سے تجاوز کرکے انہوں نے بغاوت و سرکشی کا رویہ اختیار کرلیا ہے تو سنت الٰہی کے مطابق دوسروں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی حکیم عبدالحمید صاحب کی سرپرستی اور جناب سید حامد صاحب کی نگرانی میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کیلئے سرگرم جدوجہد کررہی ہے پچھلے کئی برسوں سے اس نے مسلم طلبہ وطالبات کو قرض وظائف دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے نئے تعلیمی سال کیلئے ۱۶ ستمبر ۱۹۹۵ء تک پھر ان طلبہ وطالبات سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں جنکے نمبر میٹرک میں ۸۰- انٹر میں ۷۵- گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن میں ۷۰ فیصد ہوں، ان کو اکتوبر میں انگریزی میں تحریری امتحان اور جنرل نالج کے امتحان اور انٹرویو کے لیے سوسائٹی کے خرچ پر مدعو کیا جائے گا جس کے بعد بالترتیب ۲۵۰- ۳۵۰- ۵۰۰ اور ۱۲۰۰ روپے ماہانہ وظائف دیے جانے کا فیصلہ کیا جائے گا، وظائف کے مستحق طلبہ کو تعلیم مکمل کرنے کے دو سال بعد سے قرض ماہ بماہ قسط وار یا یکمشت واپس کرنے کے لیے پابند ہونا ہوگا۔ خواہشمند سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی سے فارم طلب کرسکتے ہیں۔

مقالات

زکوٰۃ اور اس کے اجتماعی نظام کی اہمیت[1]

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ بنگلور

زکوٰۃ کی حقیقت واہمیت | اسلام ہر حیثیت سے ایک کامل دین اور جامع شریعت کا حامل ہے اور اس کے تمام احکام وقوانین انتہائی حکیمانہ اور دیدہ ریزی پر مبنی ہیں، جن میں کسی قسم کا نقص و عیب موجود نہیں ہے، اسلامی نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک طرف وہ خالق کا تعلق مخلوق سے جوڑتا ہے تو دوسری طرف خود انسانوں کے درمیان باہمی روابط استوار کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانی بھائی چارے اور ایک دوسرے کی غمخواری کے مظاہر بھی سامنے آتے ہیں۔ اسلام چونکہ مساوات انسانی کا اولین علمبردار ہے اس لیے وہ انسانوں کے درمیان بہت زیادہ تفاوت اور فرق وامتیاز کو پسند نہیں کرتا، اس مقصد کے لیے اس نے ایک معاشی واقتصادی نظام جاری کردیا ہے جو امیر وغریب کے فرق کو کم کرنے اور پس ماندہ طبقوں کو اوپر اٹھانے پر زور دیتا ہے، اسی مقصد سے اس نے زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے جو حد درجہ حکیمانہ اور متوازن ہے کیونکہ وہ ایک علیم وخبیر ہستی کی جانب سے مقرر کیا ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں ابدیت وعالمگیری کی وہ شان پائی جاتی ہے جو دنیا کے کسی بھی دوسرے مذاہب یا نظام میں پائی نہیں جاتی یہ ایک عظیم عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم ترین معاشی واصلاحی نظام بھی ہے۔

---

[1] یہ کلیدی خطبہ دارالشریعہ بنگلور کے سمینار منعقدہ ۱۲، ۱۳ مارچ ۱۹۹۵ء کے لیے لکھا گیا تھا۔

قرآن مجید کی تصریح کے مطابق اگرچہ سابقہ انبیائے کرام اور ان کی امتوں پر بھی زکوٰۃ فرض تھی مگر اس کی نوعیت اسلامی نظام سے بالکل مختلف تھی علاوہ ازیں دیگر ادیان میں یہ تصور رفتہ رفتہ پوری طرح مٹ گیا اور اس کی حیثیت ایک دینی فریضے کی سی باقی نہیں رہی، اس کے برعکس اسلام نے بطور عبادت اسے ایک لازمی فریضہ قرار دیا ہے کہ ہر مالدار (صاحبِ نصاب) اپنی فاضل دولت کا ایک متعین حصہ (۲½ فیصد) سالانہ زکوٰۃ نکالے اور اسے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرے تاکہ ناداروں اور بے کسوں کو اپنی محرومی کا احساس نہ رہے اور وہ خود کو اس دنیا میں تنہا اور بے یار و مددگار نہ سمجھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ وہ اپنی منصوبہ بندی کے تحت کسی کو امیر بناتا ہے تو کسی کو غریب تاکہ ہر ایک کی آزمائش ہوتی رہے۔ زکوٰۃ کے معنی طہارت اور نمو کے ہیں، لہٰذا جو شخص زکوٰۃ دیتا ہے اس کے مال کی طہارت بھی ہوتی ہے اور اس میں اضافہ بھی ہوتا ہے، یہ نہیں کہ زکوٰۃ دینے سے مال میں کمی واقع ہو جاتی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا کر کے اسے بڑھا دیتا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو شخص اسلامی حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کرے اس کے ساتھ جنگ کی جا سکتی ہے، جیسا کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والوں کے ساتھ جنگ کی تھی، کیونکہ قرآنی تصریح کے مطابق ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا ہے۔ (حج: ۴۱)[1] اور یہ نظام خلافت راشدہ میں پوری طرح قائم تھا۔

نماز اور زکوٰۃ دونوں توأم ہیں اور ان میں تفریق کرنے سے خدا کے قائم کردہ نظام میں خلل واقع ہوتا ہے، کیونکہ نماز جس طرح خدائی حقوق کی نمائندگی کرتی ہے اسی طرح

[1] معارف: اس کی تائید سورہ توبہ کی بعض آیات سے بھی ہوتی ہے۔

زکوٰۃ بندوں کے حقوق کی مظہر دکھائی دیتی ہے اور ان دونوں ہی کو ادا کرنے سے بندہ میں اخلاق کریمانہ کا نمو ہوتا ہے اور اس کے انسانی جذبات بلند ہوتے ہیں۔ جس معاشرہ میں یہ دونوں فرائض باحسن طور پر پورے ہو رہے ہوں وہ معاشرہ نہایت درجہ صالح و متوازن اور مثالی رہتا ہے۔

اسلام کا نسخۂ کیمیا اسلام نے معاشرتی و تعلیمی اصلاح کے لیے ایک ایسا اقتصادی و مالیاتی نظام بطور عبادت جاری کر دیا ہے جس پر اگر صحیح معنی میں عمل کیا جائے تو نہ صرف مسلم معاشرہ کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے بلکہ رفتہ رفتہ خود غریبی بھی ختم ہو سکتی ہے جس طرح کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور خلافت میں ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس وقت لوگ زکوٰۃ کی رقم لے کر نکلتے تھے مگر کوئی انہیں قبول کرنے والا نہیں ملتا تھا، آج کل سیاسی طور پر غریبی ہٹانے کا خوب پروپگنڈہ کیا جا رہا ہے، مگر عملی طور پر کسی بھی ملک یا قوم کے سامنے کوئی ٹھوس پروگرام نہیں ہے، بلکہ یہ نسخۂ کیمیا صرف اسلام کے پاس موجود ہے کہ اس نے مالداروں پر زکاۃ بطور عبادت فرض کر کے غریبی اور مفلسی کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے حل کر دیا ہے، اس طرح اسلام نے دولت کو مرتکز کرنے کے بجائے اسے متحرک کر کے معاشرہ میں توازن قائم کر دیا ہے، نیز اس کے ساتھ اس نے بڑی حکمت اور دوربینی کے ساتھ مال زکوٰۃ میں ایک ایسی دفعہ بھی رکھ دی ہے جو خود اسلام کے بازوؤں کو مضبوط کرنے، مسلمانوں کا جماعتی نظام قائم کرنے اور مسلم معاشرہ کا دفاع کرنے کی راہ میں نہایت درجہ اہمیت کی حامل ہے۔

بدنظمی و انتشار کے نقصانات ہمارے معاشرہ میں زکوٰۃ کا نظام صحیح طور پر قائم نہ ہونے کی بنا پر اس کے فوائد ظاہر نہیں ہو رہے ہیں، غریب بدستور غریب ہیں، مقروض

حسب حال مقروض ہی ہے، جاہل و ناخواندہ طبقہ برابر ناخواندہ ہی دکھائی دے رہا ہے، مفلس و قلاش لوگوں کی حالت میں بھی کسی قسم کا ردو بدل نہیں ہو رہا ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرنے اور علمی میدان میں لادینی تحریکوں کا مقابلہ کرکے اسلامی نظام حیات کی برتری ثابت کرنے والے بھی بدستور اجنبی اور بے یار و مددگار نظر آرہے ہیں (جو فی سبیل اللہ کے دائرے میں آتے ہیں) تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج زکوٰۃ کا صحیح نظام قائم نہیں ہے اور لوگ زکوٰۃ کے صحیح مصارف سے ناواقفیت کی بنا پر زکوٰۃ کی رقم جہاں تہاں خرچ کرکے اسے برباد کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے مصارف اور اس کے اجتماعی مصالح سے ہر شخص واقف نہیں ہے، لہٰذا لوگ انفرادی طور پر زکوٰۃ اندھادھند خرچ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اصل حقداروں کو ان کا حق مل نہیں پاتا، بلکہ مستحق لوگ زیادہ تر محروم ہی رہ جاتے ہیں جب کہ دوسری طرف بلاتحقیق گداگروں اور بھکاریوں کو زکوٰۃ کا مستحق سمجھ کر ساری رقم ان پر لٹادی جاتی ہے اور بسا اوقات انہیں کسی ایک مقام پر بھیڑ بکریوں کی طرح اکٹھا کرکے بھگدڑ مچائی جاتی ہے، چنانچہ اسی سال ۲۸ فروری کے انڈین ایکسپریس کی ایک خبر کے مطابق ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں کم از کم چھ آدمی بھگدڑ کے دوران کچل کر مر گئے اور بارہ زخمی ہو گئے۔ جو ایک اسکول میں زکوٰۃ کے کپڑے حاصل کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

واضح رہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر مانگنے والا زکوٰۃ کا مستحق ہو جس طرح کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جو سوال نہ کرتا ہو وہ حاجت مند نہ ہو۔ کیونکہ ایک شریف اور غیرت مند آدمی مانگنے کے لیے مالداروں کے پاس کبھی نہیں جاتا۔ لہٰذا اگر زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم ہو جائے تو ہر حاجت مند کو اس کی ضرورت بھر امداد مال زکوٰۃ

سے مل سکتی ہے اور گداگروں کا سدباب ہو سکتا ہے، کیونکہ زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ اجتماعی پیمانے پر مستحق کی مدد تحقیق و تفتیش کے بعد کی جائے اور غیر مستحق لوگوں کو زکوٰۃ کی قیمتی رقم ہڑپ کرنے سے روکا جائے، ورنہ ہمارے معاشرتی، معاشی اور تعلیمی مسائل حل نہیں ہو سکتے بلکہ ہمارا معاشرہ بدستور حقیر و ذلیل اور ناخواندہ ہی رہے گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نظام ہماری پستی اور جہالت ختم کرنے اور اسلامی نظام کو بروئے کار لانے کی غرض سے جاری کیا ہے،

ہندوستانی مسلمانوں کی بے قیادتی اور اس کا حل

مگر ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ صورتحال بے قیادت ہونے کی وجہ سے بڑی افسوسناک اور حد درجہ پست دکھائی دے رہی ہے، اگر مسلمانوں کے درمیان نظم و ضبط ہوتا اور وہ جماعتی زندگی گزار رہے ہوتے تو یہ صورتحال پیدا نہ ہوتی۔ اس بے جماعتی زندگی کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ اسلامی نظام زکوٰۃ کی اہمیت ہی ختم ہوگئی ہے اور اسلام کے اس اہم معاشی ستون کو منہدم کرکے قوم کو مفلسی و تاریکی کے غار میں ڈھکیل دیا گیا ہے جو خدائی نظام اسلامی معاشرہ کو اوپر اٹھانے اور اسے ترقی کے بام عروج پر پہنچانے کے لیے آیا تھا وہ آج بالکل اجنبی بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان ہر سال اربوں نہ سہی کروڑوں روپے بطور زکوٰۃ نکالتے ہوں گے۔ مگر یہ رقم کہاں جا رہی ہے اور اس سے قوم و ملت کو کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر یہی رقم پورے نظم و ضبط کے ساتھ خرچ کی جائے تو پھر مسلم معاشرہ میں ایک حیرت انگیز انقلاب آسکتا ہے اور قوم کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے، لہٰذا ہندوستانی مسلمان جب تک کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرح بھٹکتے رہیں گے وہ اجتماعیت کے فوائد سے بدستور محروم رہیں گے اور زکوٰۃ کا اجتماعی نظام خود مسلمانوں کی اجتماعیت کی طرف ایک اولین قدم ہے'

اور اس اقدام کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک شیرازہ میں باندھنا اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانا بھی ممکن دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام ضرور ہے لیکن اگر کچھ مخلص اور باہمت لوگ اس کام کے لیے کمربستہ ہوجائیں تو اس مشکل کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہماری ملت کے تن مردہ میں زندگی کی روح پھونکنے کے لیے نئے خون اور نئی قیادت کی ضرورت ہے۔

زکوٰۃ جماعتی نظام کا بھی وسیلہ

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زکوٰۃ کی تنظیم سے خود معاشرہ کی تنظیم بھی عمل میں آسکتی ہے اور اس اقدام کے ذریعہ محروم افراد میں اعتمادِ نفس پیدا ہوتا ہے جو مسلم معاشرہ کو صالح بنانے اور اسے ترقی کی منزلیں طے کرانے کی راہ میں ایک اہم محرک کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو جس طرح افراد کی اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے، اسی طرح اسے جماعتی نظام کا بھی وسیلہ قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی میں جہاں پر زکوٰۃ کی بحث کی ہے اسکی ابتداہی اس جملے سے کی ہے کہ: "اس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے"۔ اور پھر مزید فرماتے ہیں: "اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے۔ (سیرت النبی: ۱۴۸/۵) نیز موصوف ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہوجاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہوجاتی ہے مگر اس کی فرضیت کے بعض مقاصد فوت ہوجاتے ہیں یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کردیں گے تو شریعت محمدی کے شناسائے رازنے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزور ان کو بیت المال میں داخل کرنے پر مجبور کیا، اگر ان کی یہ بات تسلیم کرلی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت

پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت وجماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہوجاتا۔"

(سیرت النبی: ۱۰۳/۵)

"کسی معاشرہ میں غربت اور فاقہ کشی کا پایا جانا ایسا سنگین مسئلہ ہے جس کی وجہ سے بہت سے معاشرتی فتنے پیدا ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا جس معاشرہ میں اس کا علاج نہ ہو وہ معاشرہ صالح اور متوازن نہیں رہ سکتا، یہی وجہ ہے کہ اسلام کا دور اول جس میں زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم تھا وہ ان معاشرتی فتنوں سے محفوظ رہا جس میں غریب اور مستحق لوگوں کے سالانہ وظیفے مقرر تھے"۔ (ملاحظہ ہو سیرت النبی: ۱۹۵/۵)

زکوٰۃ کے مصارف

قرآن مجید کی تصریح کے مطابق زکوٰۃ کے مستحق یہ آٹھ قسم کے لوگ ہیں۔

(۱) فقراء یعنی محتاج اور ضرورت مند لوگ (۲) مساکین یعنی مفلس و نادار لوگ جو بالکل خالی ہاتھ ہوں (۳) عاملین، یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والے (۴) وہ لوگ جن کی دلجوئی مقصود ہو یعنی نومسلم وغیرہ (۵) غلاموں اور قیدیوں کو آزاد کرانے کے لیے (۶) غارمین یعنی قرضداروں کا قرضہ ادا کرنے کے لیے، جنھوں نے گناہ کے کاموں میں قرض نہ لیا ہو۔ (۷) فی سبیل اللہ، یعنی اللہ کے راستے میں کام کرنے والے کے لیے (۸) اور مسافروں کے لیے جو اپنے وطن سے دور کسی مصیبت میں پھنس گئے ہوں۔ (توبہ: ۶۰)

حدیث نبویؐ میں تصریح ہے کہ زکوٰۃ انہی آٹھ قسم کے لوگوں کا حق ہے اور انکے علاوہ دوسرا کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ہوسکتا اور ان اقسام میں بڑی جامعیت پائی جاتی ہے اور یہ ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا ایک وسیع منصوبہ ہے مگر ان مصارف سے ناواقفیت کی بنا پر آج ہماری ملت میں زکوٰۃ کا ایک محدود اور تنگ دائرہ بنا دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے غیور اور خوددار قسم کے لوگ اس خدائی امداد سے بالکل محروم رہ جاتے ہیں اور پیشہ ور

قسم کے بھکاریوں کی خوب بن آتی ہے اور یہ صورت حال نہایت درجہ افسوسناک ہے، لہذا جتنی جلد ہوسکے اس کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ اگر زکوٰۃ کا صحیح نظام قائم ہو جائے تو سڑکوں پر گداگر دکھائی نہیں دیں گے جو مسلم معاشرہ کے ماتھے پر کلنک کا ایک ٹیکہ ہیں۔

فقیر کون ہے؟ آج کل فقراء و مساکین کی حقیقت بالکل مستور ہو کر رہ گئی ہے۔ فقیر (جمع فقراء) ہمارے عرف میں بھکاری کو کہا جاتا ہے، جبکہ شرعی نقطہ نظر سے لفظ فقیر غنی (مالدار) کے بالمقابل آتا ہے اور فقہ حنفی کی رُو سے فقیر وہ شخص ہے جو صاحب نصاب نہ ہو یعنی وہ شخص جس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوئی ہو، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"فقیر وہ ہے جس کے پاس تھوڑا سا مال ہو اور وہ نصاب سے کم ہو۔ یا بقدر نصاب تو ہو مگر وہ بڑھنے والا نہ ہو، یا اس کی ضرورت سے زیادہ نہ ہو" (فتاویٰ عالمگیری: ۱/۱۸۷)

اس اعتبار سے ہر وہ شخص جو نصاب (۷½ تولے سونا یا ۵۲½ تولے چاندی) سے کم مال رکھتا ہو وہ فقیر ہونے کے لحاظ سے زکوٰۃ کا اولین مستحق ہے، اگرچہ وہ کمانے کھانے والا ہو اور دیکھنے میں عزت دار اور سفید پوش نظر آتا ہو۔ خواہ وہ عالم ہو یا غیر عالم، طالب علم ہو یا غیر طالب علم، لنگڑا لولا ہو یا صحت مند، یتیم ہو یا بیوہ، ہنر مند ہو یا غیر ہنر مند اور اسی صف میں دین و ملت کی خدمت کرنے والے اہل علم، مبلغ، مدرس اور طلبہ سب عمومی طور پر داخل ہو سکتے ہیں جو محتاج و تنگ دست ہوں، یعنی صاحب نصاب نہ ہوں، چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس سلسلے میں فقراء و مساکین کی حسب ذیل تین قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔ "فقراء و مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے لنگڑے، مفلوج، کوڑھی۔

۲۔ یا وہ محنت (تو) کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے۔ جیسے مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم جو لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے۔

۳۔ اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر ہیں اور فاقہ کرتے ہیں" (سیرت النبی: ۵/۱۲۰-۱۲۶)

فقراء میں ایک ترجیح دیکھئے فقیر اور مسکین کے معنی میں کتنی وسعت ہے اور آج ہماری ملت کے اندر فقیر اور مسکین کے نام پر کون لوگ زکوٰۃ کی رقم بٹور رہے ہیں؟ اور خاص کر دینی و ملی خدمتگاروں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ بلکہ کسی "عالم فقیر" کو زکوٰۃ دینے کے تصور سے ہماری ملت گویا کہ بالکل ناواقف ہے اور لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ کسی عالم کو زکوٰۃ بالکل جائز نہیں ہے حالانکہ فتاویٰ عالمگیری میں صاف مذکور ہے کہ ایک "عالم فقیر" کو ایک "جاہل فقیر" پر ترجیح دینی چاہیے، جیسا کہ خود علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر کرتے ہیں:

"فقراء میں ان خوددار اور مستورالحال شرفاء کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ .... ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں، اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لیے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرے سے پہچان سکتے ہو کہ وہ حاجت مند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے"۔ (البقرہ۔ سیرۃ النبی: ۱۷۲/۵)

زکوٰۃ کے نظم اجتماعی کی ضرورت

خدائی شریعت کی ان مصلحتوں کو وہی جان سکتے ہیں جو خدائی شریعت کا صحیح علم رکھنے والے ہوں، ورنہ صاف ظاہر ہے کہ عوام دین کی حکمتوں اور مصلحتوں سے بالکل لاعلم ہیں، اسی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں وہ نتائج نہیں نکل رہے ہیں جو واقعتاً نکلنے چاہئیں، الغرض ضرورت مند کون ہے اور کون نہیں ہے؟ اسکا صحیح حال جاننے کے لیے ہمارے معاشرے کا ایک سروے کرنے کی ضرورت ہے اور جبتک یہ کام اجتماعی طور پر اور پوری دیانتداری کے ساتھ نہ کیا جائے مسلم معاشرہ کا سدھار نہیں ہوسکتا اور اس سلسلے میں حسب ذیل دلائل بھی ملاحظہ ہوں:

۱۔ اوپر سورۂ بقرہ کی جو آیت (۲۷۳) مذکور ہے اور اس میں فقراء کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ یہ ہیں: (الف) وہ اللہ کے راستے میں گھرے ہوئے ہوں (ب) وہ اپنی دینی مصروفیت کی وجہ سے کوئی کاروبار نہ کر سکتے ہوں (ج) ناواقف شخص ان کے سوال سے پرہیز کرنے کی وجہ سے انہیں مالدار تصور کرتا ہو (د) ان کے حلیہ سے انکا محتاج ہونا صاف ظاہر ہو رہا ہو (ھ) وہ لوگوں سے لپٹ کر نہ مانگتے ہوں۔

اگرچہ فقر و تنگدستی کا وصف جس شخص میں بھی پایا جائے وہ زکوٰۃ کا مستحق ضرور ہے مگر خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید نے یہ جو پانچ اوصاف بیان کیے ہیں ان کی رُو سے ترجیح

ایسے مستور الحال شرفاء کو ہونی چاہیے اور ان اوصاف و صفات کی تفتیش و تحقیق کے لیے زکوٰۃ کا اجتماعی نظام ضروری ہے، جس طرح کہ عام فقراء و مساکین کا صحیح حال جاننے کے لیے بھی تلاش و جستجو لازمی ہے۔ ورنہ زکوٰۃ کے فوائد سے اصل مستحق محروم رہ جائیں گے۔

چنانچہ اس آیت (بقرہ: ۲۷۳) کی تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: "ہمارے ملک میں اس آیت کے مصداق سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دینیہ کی اشاعت میں مشغول ہوں"۔ (تفسیر بیان القرآن: ۱/۱۶۴)

اور مفتی محمد شفیع تحریر فرماتے ہیں: "فقراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے"۔ (معارف القرآن: ۱/۲۴۲)

۲۔ خود بعض احادیث میں مذکور ہے کہ مساکین (فقراء) وہ نہیں ہیں جو گھر گھر بھیک مانگتے پھر رہے ہوں، بلکہ اصل مساکین وہ ہیں جن کے صحیح حال سے لوگ (عموماً) بے خبر رہتے ہوں، چنانچہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے: "مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک یا دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہیں، صحابہ نے پوچھا کہ پھر مسکین کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ جو حاجتمند تو ہے مگر اس کا (بظاہر) پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا"۔ (مسلم: ۲/۷۱۹)

۳۔ زکوٰۃ چونکہ ایک دینی و شرعی فریضہ ہے لہٰذا جو شخص زکوٰۃ دیتا ہے وہ کسی پر احسان نہ دھرے، کیونکہ وہ ایک خدائی فریضہ ادا کر رہا ہے، مگر زکوٰۃ لینے والا (جو ایک غیرت مند شخص ہو) وہ کسی سے زکوٰۃ لینے میں ایک طرح کا عار محسوس کرتا ہے، اس لیے اگر وہ بیت المال سے لے تو وہاں پر ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ نظم اجتماعی کی صورت میں نہ کسی پر احسان جتانا ہوگا اور نہ اس میں عار کی کوئی بات ہوگی، چنانچہ اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

"اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا ہے کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے کا ممنون احسان بنکر اپنی ذلت محسوس نہ کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے۔" (سیرت النبی: ۵/۲۰۳)

۴۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نظام دین وملت کے بازو مضبوط کرنے کی غرض سے مقرر کیا ہے، لہذا زکوٰۃ دینداروں اور شریعت پر چلنے والوں کا حق ہے اور وہ بے دینوں اور فسق وفجور میں مبتلا لوگوں کو نہیں دینا چاہیے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے تصریح کی ہے، کیونکہ ایسے لوگ تو سزا کے مستحق ہوتے ہیں، لیکن ان کے فسق وفجور کے باوجود الٹے انکی مدد کس طرح کی جاسکتی ہے؟ (ملاحظہ ہو فتاوٰی ابن تیمیہ: ۲۵/۸۷)

اگر اس ضابطہ پر سختی کے ساتھ عمل کیا جائے تو اس سے لوگوں کے کردار اور کیرکٹر کو درست کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے اور غیر اسلامی نظریات رکھنے والے برائے نام مسلمانوں کی ذہنی دھلائی بھی عمل میں آسکتی ہے جو مسلم معاشرہ کی تطہیر کا باعث ہوگا لہذا اس مقصد کے لیے بھی زکوٰۃ کا اجتماعی نظام ضروری ہے تاکہ ہر شخص کو جو کچھ دیا جائے وہ تحقیق کے بعد دیا جائے۔

۵۔ زکوٰۃ دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت بھر رقم دی جائے یہ نہیں کہ دس بیس روپے دے کر چلتا کر دیا، بلکہ اگر کوئی اہل وعیال والا ہے تو اسے اس قدر دیا جائے کہ وہ کسی اور کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ذلت سے بچ جائے۔

جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔ اگر کوئی محتاج طالب علم یا دینی خدمت گار ہے تو اسکا وظیفہ مقرر کر دیا جائے، جس طرح کہ دور رسالت اور دور خلفائے راشدین میں خود صحابۂ کرام کے وظائف مقرر تھے۔ اگر کوئی بے سہارا یا بے روزگار ہے تو اسے برسر روزگار بنا دیا جائے، اگر کوئی مقروض ہے تو اس کا قرضہ ادا کر دیا جائے، اس طرح کے متعدد مصارف ہیں جن میں سے بعض فقراء ومساکین کے تحت آتے ہیں تو کچھ فی سبیل اللہ کے تحت۔

۶۔ آج کل جو زکوٰۃ نکالی جاتی ہے وہ غریبوں اور بے کسوں کی معاشی حالت درست کرنے کے لیے نہیں بلکہ عموماً عید الفطر منانے کی غرض سے ہوتی ہے، تاکہ عید کی خوشیوں میں غریب بھی شریک ہو جائیں۔ اگرچہ مسلمانوں کے لیے عید کی اہمیت بھی ضرور ہے مگر زکوٰۃ کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں کہ مسلمان کسی نہ کسی طرح عید منالیں اور پھر سال بھر ننگے بھوکے ہی رہیں بلکہ اس کا اصل مقصد مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی اور معاشرتی پسماندگی کو دور کرنا اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنا ہے، تاکہ وہ خود کفیل بن کر دست سوال دراز کرنے کی ذلت سے بچ جائیں۔ لہذا اس میدان میں پیش قدمی کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔

زکوٰۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ بھی ہے، یعنی اللہ کی راہ میں۔ اس کی مراد کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک اس سے مراد جہاد ہے تو بعض کے نزدیک حج کو ترجیح حاصل ہے، کچھ فقہاء نے اس سے تمام امور خیر مراد لیا ہے جو اللہ کے راستے میں ہوں، لیکن اس سے انفرادی امور نہیں بلکہ ملت کے اجتماعی امور مراد ہیں اور جہاد مراد ہونے کی صورت میں جس طرح اس میں عسکری جہاد شامل ہو سکتا ہے اسی طرح اس میں علمی وقلمی جہاد بھی شامل ہو سکتا ہے ...... اور یہ

بات قرآن اور حدیث کے دلائل کی رُو سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حکم ہے کہ "تم اس قرآن کے ذریعہ کافروں کے ساتھ زور و شور کے ساتھ جہاد کرو" (فرقان: ۵۲)

قرآن کے ذریعہ جہاد کرنا سے ظاہر ہے کہ قرآنی دلائل کے ذریعہ علمی و قلمی جہاد کرنا مراد ہے اور حدیث نبوی میں مذکور ہے کہ: "تم مشرکین سے اپنے مالوں اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعہ جہاد کرو" (ابوداؤد)

پچھلے ادوار میں اگر عسکری جہاد کی اہمیت تھی تو موجودہ دور میں علمی و دعوتی جہاد کی اہمیت بڑھ گئی ہے، کیونکہ آج مسلمان اقوام عالم سے عسکری جہاد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، لہذا آج ان کے لیے علمی و دعوتی جہاد ہی موزوں نظر آتا ہے، جو مسلمانوں کی ملی زندگی کا نمونہ ہے اور ایک دوسرے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کو طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا کر کے ان کے دین و ایمان کو غارت کیا جا رہا ہے، جدید مادہ پرستانہ علوم و افکار اور الحادی فلسفے پوری نوع انسانی کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے آج ان الحاد پرور افکار و فلسفوں کا مقابلہ کرنا وقت کا سب سے بڑا جہاد ہے، لہذا موجودہ دور میں زکوٰۃ کا ایک بہترین مصرف یہ ہے کہ ایسے قابل اور ہونہار اہل علم کو زکوٰۃ کی رقم سے سالانہ وظائف جاری کر کے تحقیق و تصنیفی کاموں میں لگایا جائے اور خاص کر ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو نہ صرف جدید فکری و مادی چیلنجوں کا جواب دے سکتا ہو بلکہ اسلام کی دعوت کو عصری تقاضوں کے مطابق موثر انداز میں پیش کر کے اقوام عالم کے ذہنوں کو بدلنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ قرآن کریم کی تصریح (فرقان: ۵۲) کے مطابق یہی سب سے بڑا جہاد ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ملی مصالح کی اہمیت و افادیت کا صحیح اندازہ عوام نہیں کر سکتے۔

بلکہ ان مصالح و فوائد کی اہمیت ذی علم اور پختہ فکر لوگوں ہی پر واضح ہو سکتی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں مشہور عرب عالم علامہ یوسف قرضاوی تحریر کرتے ہیں:

"زکوٰۃ کا نظام انفرادی طور پر نہیں بلکہ حکومت کے فرائض میں داخل ہے، کیونکہ زکوٰۃ کا مصرف صرف فقراء اور مساکین ہی کیلئے نہیں بلکہ اس سے مسلمانوں کے مصالح عامہ بھی مقصود ہیں، جن کا صحیح اندازہ افراد نہیں کر سکتے، بلکہ اس کا صحیح اندازہ مسلمانوں کی جماعت کے معاملہ فہم لوگ اور اہل شوریٰ ہی کر سکتے ہیں، جیسے تالیف قلوب، جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری اور اشاعت اسلام کے لیے مبلغین کی تیاری وغیرہ امور کے لیے خرچ کرنا" (خلاصہ از فقہ الزکوٰۃ: ۲/ ۵۶۷)

زکوٰۃ کے نظم اجتماعی کے دلائل

مذکورہ بالا فوائد و برکات سے ہماری ملت اسی وقت مستفید ہو سکتی ہے جب کہ زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم ہو جائے، مگر اس سلسلے میں بعض حلقوں کی جانب سے کچھ شکوک و شبہات پیش کر کے اس سلسلے میں پیش قدمی کرنے والوں کی ہمت شکنی کی جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اس قسم کا کام اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں نہیں ہوا۔ لہذا ذیل میں شرعی نقطۂ نظر سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لے کر قرآن، حدیث اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کی روشنی میں اجتماعی نظام زکوٰۃ کے متعدد پہلوؤں کو نمایاں کیا جا رہا ہے تاکہ کسی بھی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

۱۔ قرآن مجید کی رو سے زکوٰۃ وصول اور تقسیم کرنا خلیفۂ وقت کی ذمہ داری ہے، چنانچہ اس سلسلے میں دو آیتیں وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ پہلی آیت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطہ سے پوری امت کو حکم ہے کہ: "آپ ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کیجیے" (توبہ: ۱۰۳)

اس آیت کی تفسیر میں متعدد فقہاء و مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اس موقع پر اموال سے مراد ہر قسم کے اموال ہیں اور ان میں اموال ظاہرہ یا باطنہ کی کوئی قید نہیں ہے (اموال ظاہرہ سے مراد مویشی اور غلہ جات ہیں، جن کو چھپانا ممکن نہیں اور اموال باطنہ سے مراد وہ اموال ہیں جن کو چھپانا ممکن ہو، جیسے سونا، چاندی اور مال تجارت وغیرہ۔)

۲۔ اس سلسلے میں دوسری آیت وہ ہے جس میں مصارف زکوٰۃ کا بیان مذکور ہے اور ان میں سے ایک مصرف "وَالعَامِلِین علیہا" بھی ہے۔ یعنی زکوٰۃ کے مال میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے امام وقت کی جانب سے مقرر کیے گئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ دفعہ نظم اجتماعی کی واضح ترین دلیل ہے، جیساکہ فقہاء و مفسرین نے تصریح کی ہے اور اسی بنا پر خلیفہ برحق حضرت ابوبکر صدیق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والوں سے جنگ کی تھی۔

۳۔ ان قرآنی تصریحات کے بعد اب حدیث نبوی کی طرف آئیے تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور مبارک میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مختلف عمال مقرر کیے تھے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں: "محرم ۹ھ میں زکاۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لیے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی"

(سیرت النبی : ۱۵۹/۵)

۴۔ دور رسالت میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں کی زکوٰۃ سرکاری طور پر وصول کی جاتی تھی اور اس بارے میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ جیساکہ ہمیں متعدد کتب حدیث میں صراحت ملتی ہے۔ نیز اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمرؓ کے

مکتوبات بھی موجود ہیں، جن میں نہ صرف زکاۃ کی سرکاری وصولی کا تذکرہ ہے بلکہ سونے اور چاندی کی زکوٰۃ وصول کرنے والوں کے لیے ضوابط بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ ان مکتوبات کی رُو سے ثابت ہے کہ دور رسالت میں بیس دینار سونے میں نصف دینار اور دوسو درہم چاندی میں پانچ درہم بطور زکوٰۃ سرکاری طور پر وصول کی جاتی تھی۔ (کتاب الاموال)۔ اسی طرح ایک حدیث کے مطابق مال تجارت کی بھی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ (ترمذی ابوداؤد)

۵۔ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ اپنے دور میں اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں قسم کے مالوں کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے اور اس کے لیے آپ نے متعدد عمال مقرر کر رکھے تھے، نیز یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے خود بھی راہ چلتے چلتے مال تجارت کی زکوٰۃ وصول کی ہے۔ (دیکھیے کتاب الاموال)

۶۔ حضرت عمرؓ نے مملکت اسلامیہ میں مختلف شہروں اور راستوں پر تجارتی مال پر محصول وصول کرنے کے لیے چوکیاں قائم کر دی تھیں اور ایسی چوکیوں کے ناظم کو "عاشر" کہا جاتا تھا اور وہ مسلمانوں کے مال تجارت سے بطور زکوٰۃ ہر سال چالیسواں حصہ وصول کرتے تھے، کیونکہ روپیہ پیسہ اور مال تجارت جب تک اپنے مقام پر رہے وہ "مال باطن" کہلاتا ہے، مگر جب وہ پبلک میں آجائے تو پھر وہ مال باطن نہیں رہتا بلکہ "مال ظاہر" بن جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

۷۔ اس اعتبار سے موجودہ دور میں بنک میں رکھا ہوا روپیہ، زیور اور انشورشدہ مال، شیئر مارکیٹ میں لگا ہوا روپیہ، مختلف کمپنیوں اور فیکٹریوں کا آڈٹ شدہ سرمایہ اور اعلان شدہ اثاثہ جات وغیرہ سب اموال ظاہرہ میں شمار ہو سکتے ہیں اور اسلامی حکومت ان کی زکوٰۃ وصول کرنے کی مجاز ہے۔

۸۔ بعض فقہاء نے بیان کیا ہے کہ دورِ رسالت سے لے کر خلافت عثمانؓ تک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم رہا۔ مگر جب حضرت عثمانؓ کے دور میں مال غنیمت کی کثرت ہوگئی تو آپ نے اموال باطنہ کی زکوٰۃ کی ادائیگی خود مال والوں کے سپرد کر دی، مگر اس کے باوجود خلیفہ کا حق زائل نہیں ہوا۔ بلکہ اس صورت میں تو وہ زبردستی بھی وصول کر سکتا ہے، جب اسے معلوم ہو جائے کہ کسی شہر کے لوگ اپنی زکوٰۃ ادا نہیں کر رہے ہیں۔

(دیکھیے بدائع الصنائع اور فتح القدیر وغیرہ)

سرکاری و غیر سرکاری تنظیمیں حاصل یہ کہ مذکورہ بالا دلائل کی رُو سے زکوٰۃ وصول اور تقسیم کرنا اولین طور پر اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ خلافت عثمانؓ کے بعد لوگوں کو اگرچہ ایک حد تک اپنی زکوٰۃ (اموال باطنہ کی) انفرادی طور پر بھی ادا کرنے کا حق ضرور ہے مگر اس سے اسلامی حکومت کا حق کسی بھی طرح ساقط نہیں ہوتا، بلکہ جب اسلامی حکومت قلت مال سے دوچار ہو جائے تو اس وقت وہ لوگوں سے زبردستی بھی وصول کر سکتی ہے۔ ہاں البتہ عوام کو اپنی زکوٰۃ کا ایک حصہ خود بھی اپنے طور پر اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کو دینے کا حق ہونا چاہیے۔ تاکہ افراد کا بھی نقصان نہ ہو اور ملت کے اجتماعی مصالح بھی پورے ہوتے رہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ جہاں پر اسلامی حکومت نہ ہو وہاں پر کیا کیا جائے؟ آیا ایسے مقامات پر مسلمان خود اپنی غیر سرکاری تنظیمیں قائم کر کے یہ کام کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو جہاں تک شرعی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس میں کوئی ممانعت یا قباحت نظر نہیں آتی۔ بلکہ شرعاً اس کی تائید و حمایت ہی دکھائی دیتی ہے، کیونکہ مسلمان جہاں بھی رہیں ان کے لیے نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا نظام بھی قائم کرنا ضروری ہے۔ یعنی نماز جس طرح اجتماعی

طور سے ادا کی جاتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی اجتماعی طور پر ادا کی جائے۔ ان دونوں میں تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ نماز اور زکوٰۃ دونوں توام ہیں اور ان دونوں کے ملاپ ہی سے اسلامی نظام کی تشکیل ہوتی ہے اور اسلام ایک روحانی و مادی مجموعہ کی حیثیت سے متشکل ہو کر جلوہ افروز ہوتا اور ایک کامل ضابطۂ حیات کا نمونہ پیش کرتا ہے اور یہ ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جس کا نمونہ پیش کرنے اور دکھی ہوئی انسانیت کے زخم پر مرہم رکھنے کے تصور سے دیگر تمام ادیان و نظامات عاجز دکھائی دیتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن اور حدیث میں ان دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ آیا ہے۔ غرض مسلمان جب غیر مسلم حکومتوں میں بھی نماز کا نظام قائم کیے ہوئے ہیں تو پھر انہیں زکوٰۃ کا نظام قائم کرنے میں کیا دشواری ہے اور ان کے ہاتھ کس نے باندھ رکھے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جو نظام مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے نقطۂ نظر سے زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا ہو اسے نظر انداز کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

ایک مرکزی کمیٹی یا مجلس شوریٰ کی ضرورت ہاں اس فریضے کو انجام دینے کے لیے مخلص اور ایماندار لوگوں کی ضرورت ہے کیونکہ اسے ہر شخص انجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتا، لہٰذا ایسے مخلص اور باہمت لوگ اٹھیں اور کمر ہمت باندھ کر معاشرہ کی کایا پلٹنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگر قومی و ملی درد رکھنے والے اصحاب اللہ کا نام لے کر کوئی مرکزی تنظیم قائم کر دیں اور پھر شہری و محلہ واری سطح پر سب کمیٹیاں بنا کر کام شروع کر دیں تو اللہ کی نصرت و حمایت بھی ظاہر ہوگی اور اس اقدام کے ذریعہ حیرت انگیز نتائج بھی برآمد ہوں گے، مگر اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا، ورنہ جگہ جگہ رخنے پیدا ہو جائیں گے اور رکاوٹیں کھڑی ہوں گی، لہٰذا مرکزی کمیٹی میں ہر طبقے اور ہر جماعت کی نمائندگی ضروری ہے، جس کی حیثیت "مجلس شوریٰ" کی سی رہے گی۔

اور اس کا کام مختلف سب کمیٹیوں کی رہنمائی کرنا اور ان کے لیے گائیڈ لائنس فراہم کرنا ہوگا، اس طرح ہماری ملت کے درمیان نظم وضبط بھی پیدا ہوگا جو اتحاد ملت کی طرف پہلا عملی قدم ہوگا اور اس سلسلے میں پیش آنے والے مختلف مسائل پر ہماری ملت کے سربرآوردہ حضرات کو سر جوڑ کر انکا حل نکالنا ہوگا، اسی غرض سے یہ سیمینار منعقد کیا گیا ہے تاکہ ہمارے علماء اور عمائد ہماری ملت کے موجودہ مسائل ومشکلات کا صحیح اور بروقت حل نکالیں اگر سب مل کر خلوص کے ساتھ عمل کریں تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جو انجام نہ پاسکتا ہو۔ لہٰذا ضرورت صرف حرکت کرنے اور ہماری ملت کو متحرک وفعال بنانے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: "اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔" (محمد : ۷)

مدرسوں اور تنظیموں میں فرق کیوں؟ اس موقع پر یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہیے کہ آج جو لوگ زکوٰۃ کے اجتماعی نظام کی مخالفت کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت جو عربی مدرسے چل رہے ہیں وہ بھی زکوٰۃ کے اجتماعی نظام ہی کی ایک شکل ہیں، ظاہر ہے کہ ارباب مدرسہ مالداروں سے زکوٰۃ وصول کرکے مستحقین (طلبہ) کو دیتے ہیں، لہٰذا اگر یہی کام کچھ لوگ تنظیم بنا کر ذرا وسیع پیمانے پر کریں اور مستحق لوگوں کی خبر گیری کریں تو یہ کام غلط کیونکر ہو سکتا ہے؟ بلکہ یہ کام باعث اجر وثواب ہوگا۔

نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ نظم اجتماعی کی صورت میں خود مدرسوں کو بھی گھر بیٹھے اجتماعی تنظیم کے ذریعہ ایک معقول رقم بطور امداد اپنے استحقاق کی بنیاد پر مل سکتی ہے اور وہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بچ کر اپنی پوری توجہ تعلیمی معیار کو بلند کرنے پر صرف کر سکتے ہیں۔

غرض زکوٰۃ کے نظم اجتماعی کے باعث اتنے فوائد وبرکات ظہور میں آئیں گے جو ہمارے تصور اور اندازہ سے بھی کہیں زیادہ ہوں گے، ہر قسم کی دھاندلیوں اور غلط کاریوں کا خاتمہ ہو کر پورا معاشرہ صاف ستھرا بن جائیگا،

لہٰذا ارباب ملت سے گذارش ہے کہ وہ ان معروضات کی روشنی میں کوئی متفقہ لائحہ عمل طے کرکے ہماری ملت کی صحیح رہنمائی کریں۔

علامہ قاضی محمد اعلیٰ بن علی تھانوی

اور

اُن کی کتاب کشاف اصطلاحات الفنون

از ڈاکٹر عطش درانی۔ اسلام آباد

مشہور وممتاز اسلامی اصطلاحات نگار علامہ قاضی محمد اعلیٰ بن علی تھانوی آج کی علمی اسلامی دنیا میں اپنے قاموسی لغت کشاف اصطلاحات الفنون (تکمیل ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء) کے باعث محتاج تعارف نہیں ہیں، لیکن یہ عظیم اصطلاح نگار گوشۂ گمنامی میں رہ جاتا اگر سپرنگر جیسا مستشرق اس کے معرکۃ الآرا کام کو تلاش کرکے ترتیب وتدوین کے بعد شایع نہ کرتا۔[۱]

علامہ تھانوی صرف اصطلاح ساز یا لغت نگار نہیں تھے بلکہ وہ ایک نابغۂ روزگار اصطلاح نگار تھے، دور جدید میں اصطلاحات سازی، اصطلاحات نگاری، ولغات نگاری میں واضح امتیاز ہوگیا ہے، جسے آج اصطلاحیات (Terminology Science) میں بنیادی اہمیت دی جارہی ہے۔[۲] "اصطلاحات سازی" ایک عمومی اور وسیع تر اصطلاح ہے جس میں باقی امور بھی اصطلاحی نظام کی ترتیب وتنظیم کے ساتھ آجاتے ہیں۔ دور جدید میں یہ ایک تکنیکی علم کی حیثیت سے سامنے آرہا ہے، جو "خصوصی مقاصد کی زبان" (LSP) کے طور پر اپنا ایک دائرۂ معانی مقرر کرتا ہے۔ یہ کام تصورات (Concepts) کو

ایک طے شدہ اور مقررہ طریقے پر اصطلاحیں مہیا کرنے کا ہے۔ جب کہ "اصطلاحات نگاری" کا کام اصطلاحوں کو مرتب کرنے اور ان تصورات کو بیان کرنے، ان کا حوالہ دینے اور ان کی تشریحات و تعریفات مقرر کرنے کا ہے، یہ بھی خصوصی زبان (LSP) ہی سے متعلق ہے، جب کہ لغات نگاری محض عمومی زبان یا زبان برائے عمومی مقاصد (LGP) کے الفاظ اور ان کے معنی مرتب کرنے کو کہتے ہیں۔

اصطلاحات نگاری اور لغات نگاری کا فرق

یہاں اصطلاحات نگاری اور لغات نگاری میں واضح امتیاز کی تفہیم ہو جانے کے بعد ہی آگے بڑھنا مناسب ہوگا، امریکی ماہر لغات ڈاکٹر سوئے ایلن رائٹ (فلاڈلفیا) نے اس کی تفصیلی وضاحت کی ہے، ان کے نزدیک لغت نگاری "لفظ" سے متعلق ہے اور اصطلاح نگاری "تصور" سے متعلق ہے۔ لغت نگاری کثیر معنویت کا اظہار ہے اور اصطلاح نگاری واحد معنی کا بیان ہے وغیرہ وغیرہ[۳۶]۔ یہ دونوں اپنے مقاصد کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ رگز جیسا عالمی ماہر اصطلاحات لکھتا ہے[۳۷]:

"لغت نگاری کا بنیادی مقصد قارئین کو متن کی تشریح میں مدد دینا ہے، جب کہ اصطلاحات نگاری کا بنیادی مقصد لکھنے والوں کو متن تیار کرنے میں مدد دینا ہے۔ یعنی لغت نگاری الفاظ کے معنی بتاتی ہے اور اصطلاحات نگاری تصورات سے (متن کے ذریعے) کسی طے شدہ اصطلاح تک پہونچنے میں مدد دیتی ہے۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ تھانوی نے اپنے دور تک کی اسلامی مشرقی اصطلاحات کو یکجا کر کے نیز ان کے تصورات، تشریحات اور تعریفات کو مرتب کر کے ایک کشاف اصطلاحات کی صورت دی، جس کی بنا پر ہم انھیں اصطلاح نگار کہتے ہیں۔

اور چونکہ انھوں نے ایک ایسے دور (اٹھارہویں صدی عیسوی) میں اتنے عظیم کام کو

مرتب کیا تھا، جب اسلامی علوم پر اپنی حد انتہا کو پہنچ جانے کے بعد جمود طاری ہو رہا تھا اور جب وقت کے عظیم علمی دانشوروں اور مفکروں کی، ایک وسیع جماعت موجود تھی، جن کی موجودگی میں انھوں نے ایک مستند مجموعہ تیار کیا، اس لیے انھیں نابغہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی، دور جدید کے اسلامی اور مستشرق مصنفین نے ان کے اس کام سے بے حد استفادہ کیا ہے، ابجد العلوم کے نواب صدیق حسن خاں سے لیکر جدید دور کی معجم لغۃ الفقہا (عربی انگلیسی) از ڈاکٹر حامد صادق قنیبی اور ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی (سعودی عرب) اور تفسیر نمونہ (ایران) میں اس کے حوالوں پر انحصار ملتا ہے، اسے سپرنگر نے تو پہلے ہی مستند ترین کتاب قرار دیا تھا[۳۸]۔ کتاب کے مصنف عموماً قاضی محمد اعلیٰ بن علی تھانوی کے نام سے معروف ہیں مگر عرب دنیا انھیں صرف "علامہ تھانوی" کے نام سے جانتی ہے[۳۹]۔ حیرت ہے کہ ایک ایسے شخص نے ہزاروں ماخذوں سے ایسا مستند ترین کام کیسے انجام دیا جب کہ وہ اپنے علاقے سے کبھی باہر نہیں نکلا۔

علامہ تھانوی تھانہ بھون ہی میں پیدا ہوئے، تحصیل علم وہیں کی، زندگی بھر وہیں رہے، وہیں وفات پائی۔ لیکن انکا نام پوری دنیا میں معروف ہوا۔ اگرچہ انکے اساتذۂ کرام کے اسمائے گرامی کتب رجال میں محفوظ نہیں ہیں تاہم یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً وہ لوگ درجۂ کمال پر فائز رہے ہوں گے، جن کے آگے علامہ تھانوی نے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان میں ان کے والد تو شامل تھے ہی، یقیناً طبعی و سائنسی علوم کے اساتذہ بھی ہوں گے، بعض اہل علم معاصرین سے ان کی مراسلت کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولوی مدن شاہجہانپوری، ملا عبد العلی بحر العلوم اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی۔ لیکن مزید تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ یہ مراسلت علمی نکات کی تلاش

دور یافت کے سلسلے ہی میں ہوئی ہوگی۔

جناب وحید اللہ خاں صدیقی نے علامہ تھانوی کی دینی، فلسفیانہ اور سائنسی تعلیم کے حصول کے سلسلے میں ایک روایت درج کی ہے کہ ایک انگریز فاضل نے ایک قصباتی کو اتنے علوم و فنون کا جامع دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ انھوں نے کس یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ اس انگریز کے زمانہ میں اس خاندان کے معمر ترین بزرگ مولانا شیخ محمد صابر کے بڑے صاحبزادے مولوی محمود صاحب زندہ تھے۔ اس نے انھی سے یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک خط لکھا۔ مولوی صاحب نے اس کے جواب میں مختصراً لکھ بھیجا:[8]

"قاضی محمد اعلیٰ نے تمام تعلیم اپنے گھر کی یونیورسٹی میں حاصل کی تھی، انھوں نے حصولِ علم کے لیے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔"

ذیل میں ان کے حالات زندگی کا اجمالی خاکہ تحریر کیا جاتا ہے۔

علامہ تھانوی تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یوپی) میں ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء میں پیدا ہوئے تھے[9]۔ ان کا خاندان عہد اکبری میں قاضی نصر اللہ بن قاضی محمد یعقوب کے زمانے سے یہاں آباد تھا، علامہ تھانوی کے زمانہ تک اس خاندان میں عدل، قضا، علم اور فضل کا سلسلہ چلا آرہا تھا، اپنے پردادا کے بارے میں کشاف کے دیباچے میں خود علامہ نے "مولانا اتقی العلما محمد صابر" کے القاب استعمال کیے ہیں، حاجی امداد اللہ مہاجر کی، حافظ ضامن شہید، مولانا شیخ محمد محدث دہلوی اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے کئی اہل علم اسی خاندان کے مشاہیر میں سے ہیں[10]۔

یہ وہ دور تھا جب اورنگزیب عالمگیر کو فوت (۱۷۰۷ء) ہوئے ڈیڑھ برس کا عرصہ گزرا تھا اور بہادر شاہ شاہ عالم تخت نشین تھا، اسی زمانے میں مرزا جان جاناں مظہر

(تقریباً ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰ء کے درمیان) اور شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء کو) پیدا ہوئے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کا چرچا تھا، گویا علامہ تھانوی کی پیدایش کے وقت اسلامی فکر عروج تک پہنچا ہوا تھا۔

قاضی نصر اللہ کے پڑپوتے شیخ سراج الدین کے تین بیٹے تھے۔ شیخ عبد الرحیم، شیخ آدم اور شیخ عبد اللہ۔ شیخ عبد الرحیم کی اولاد میں حاجی امداد اللہ مہاجر کی اور حافظ ضامن علی شہید اور دوسرے متعدد علما و مشائخ گزرے۔ شیخ آدم کی اولاد میں سے قاضی قطب الدین، قاضی نجابت علی، قاضی سعادت علی، قاضی محبوب سی، قاضی عنایت علی اور قاضی عبد الرحیم قضا کے عہدے پر فائز رہے شیخ عبد اللہ کی اولاد میں بھی اکثر لوگ قاضی تھے[11]۔

گھر اور خاندان ہی میں علم و فضل کی ایسی فضا موجود ہونے کی بنا پر علامہ تھانوی کو علم حاصل کرنے اور مطالعہ و حوالہ کے لیے اپنے علاقے سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی، انھوں نے اصول، قواعد، دینیات اور عربی کی تمام تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور تمام طبعی، نقلی و عقلی علوم اور فلسفہ و ریاضی، فلکیات، طبیعیات اور طب وغیرہ خود پڑھے، جس کا ذکر دیباچہ میں موجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علامہ جلد ہی عہدہ قضا پر نائب قاضی کے منصب پر فائز ہوگئے تھے، بعض کے نزدیک ۱۱۴۷ھ/۱۷۲۵ء سے قبل فائز ہوگئے تھے، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس وقت ان کی عمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی، اس کم سنی میں عہدۂ قضا پر مقرر کیا جانا ممکن نہیں ہے تاہم یہ مسلم ہے کہ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۳ء کو وہ قاضی کے منصب پر فائز تھے، کیونکہ اس تاریخ سے ان کی دستاویزات ملتی ہیں، اس وقت سے

۱۱۹۱ھ / ۷۷-۱۷۷۶ء میں جب ان کی وفات ہوئی وہ اس منصب پر فائز رہے مفتی الٰہی بخش کاندھلوی نے مادۂ تاریخ لکھ کر ۱۱۹۱ھ درج کیا ہے[32]

سال تاریخ وفاتش ہاتفے

جنت الاعلیٰ لہ مثواہ گفت ۱۱۹۱ھ

علامہ تھانوی کی قبر خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کی ایک سہ دری میں ہے، حکیم محمد عمر چرتھاولی اس قبر کے بارے میں لکھتے ہیں[33]

"ایک طرف گوشہ جنوب و مشرقی احاطہ مسجد میں مولوی محمد اعلیٰ کی قبر مثل پارۂ ابر شجر کے سائے میں خدا کے ہمسایے میں واقع ہے"۔

قاضی محمد مکرم مائل کہتے ہیں :

"حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کا روحانی اور علمی فیض اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ چنانچہ جب کوئی دقیق مسئلہ میرے سامنے آتا ہے اور انتہائی کوشش و کاوش کے باوجود حل نہیں ہوتا تو میں قاضی صاحب کے قریب جاکر بیٹھ جاتا ہوں اور تھوڑی ہی دیر میں اس مسئلہ کا حل مجھے مل جاتا ہے"۔

جناب وحید اللہ صدیقی اس پہ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں[34]

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کے وقت یہاں کوئی عمارت نہیں ہوگی اور قاضی صاحب کو ایک آباد جگہ میں دفن کر دیا گیا ہوگا، عمارتیں بعد میں بنی ہوں گی اور رفتہ رفتہ یہ قبر خانقاہ امدادیہ اشرفیہ اور مسجد پیر محمد والی کے احاطہ میں آگئی ہوگی"۔

علامہ تھانوی نے مجرد زندگی گزاری، اس لیے ان کا نسلی سلسلہ آگے نہیں چلا، لیکن معنوی سلسلہ ان کی وہ کثیر تصانیف ہیں جنھوں نے انھیں ایک نابغہ کی حیثیت سے

متعارف کرایا ہے، ان میں کشاف اصطلاحات الفنون سب سے اہم ہے، اس کے بعد دوسری اہم کتاب احکام الاراضی ہے، دو مزید کتابوں قواعد ذوی الارحام اور رسالہ تکسیر واوفاق نیز حاشیہ فتاویٰ حمادیہ اور حاشیہ رسالہ اقلیدس پر ان کے حواشی کے نسخے دستیاب ہیں[35]

تعلیقات و حوالہ جات

[1] کشاف اصطلاحات الفنون ۱۱۵۸ھ / ۴۵-۱۷۴۴ء میں لکھی گئی۔ پہلی بار اس کا مخطوطہ سپرنگر کو ۱۸۴۶ء میں دہلی سے ملا تھا، جو ان تین قلمی نسخوں میں سے ایک تھا، جن پر مصنف کے دستخط ثبت تھے، اس کے بعد انھوں نے اس کا ایک منقول مصدقہ نسخہ مصنف کے پوتے سے حاصل کیا (پیش لفظ ص: ۴)۔ کتاب کو انھوں نے مولوی محمد وجیہ (صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ) مولوی عبدالحق اور مولوی غلام قادر جیسے اہل علم سے مدون کرایا، کتاب کی تدوین میں اصل ماخذوں تک رسائی حاصل کی گئی انکے مطابق متن درست کیا گیا بلکہ بعض اوقات نئے حصے بھی شامل کیے گئے، تاہم انھوں نے اپنی طرف سے کوئی عبارت شامل نہیں کی بلکہ ان نئے حصوں کو بھی نشان زد کر دیا گیا ہے تاکہ امتیاز ملحوظ رہے، آخر میں تمام اصطلاحات پر اشاریہ بھی تیار کیا گیا ہے، یہ کام زیادہ تر مولوی محمد وجیہ نے انجام دیا ہے، (پیش لفظ، ص: ۱) کتاب کے ساتھ اس کے بعض ماخذ بھی ترجمہ کر کے شایع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا تاہم ۱۸۵۴ اور ۱۸۶۲ء کی اشاعتوں کے ساتھ صرف رسالہ شمسیہ از نجم الدین الکاتبی قزوینی کا انگریزی ترجمہ منسلک کیا گیا ہے، جس پر مترجم نے یکم اپریل ۱۸۵۴ء کی تاریخ درج کی ہے، اس کا اصل عربی متن بھی اشاریہ سے پہلے دے دیا گیا ہے۔ متن ۱۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جس کے آخر میں طباعت کی تاریخ ۴ محرم ۱۲۷۸ھ / ۱۳ جولائی ۱۸۶۱ء درج ہے، اصل متن یہ ہے:

" یوم سبت اربع لیال خلت من شہر محرم سنۃ الف، مائتین و ثمان و سبعین سنۃ

من ہجرۃ مطابق ثلثۃ عشر لو اس شہر الجولائی سنۃ الف وثمان مائۃ واحدی وستین من السنین عیسویہ"

اشاریہ کے آخر میں طباعت کی تاریخ ۶ رجب ۱۲۷۸ھ / ۸ جنوری ۱۸۶۲ء درج ہے۔ پہلا ضمیمہ:۔ رسالہ شمسیہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ کے سلسلہ نمبر ۸۸ کے تحت شایع کیا گیا جسکا انگریزی ترجمہ ایولیس سپرنگر نے کیا اور بنگال ملٹری آرفن پریس ۱۸۵۴ء میں کیپٹن ناساسیلوتیس کے ساتھ مل کر قسط وار شایع کیا۔ پہلی قسط ۱۸۵۳ء/ ۱۸۵۴ء میں اور آخری ۱۳ جولائی ۱۸۶۱ کو شایع ہوئی۔ بعد ازاں اصل متن، اشاریہ اور ضمیمہ ملا کر لیبز پریس کلکتہ سے ۱۸۶۲ء میں دو جلدوں میں شایع کیا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: کشاف اصطلاحات الفنون۔ کتاب کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ معارف؛ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانہ میں بھی یہ نسخہ موجود ہے، مگر ناقص الآخر ہے۔ دیکھیے: نورالحسن راشد محمد علی تھانوی "فکر و نظر" اسلام آباد، اکتوبر دسمبر ۱۹۸۹ء ص: ۸۹ تا ۹۰ ۵ تفصیلی مباحث برائے اصطلاح، اصطلاحات سازی، اصطلاحات نگاری اور دور جدید کے علم اصطلاح کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر عطش درانی، اردو اصطلاحات سازی، اسلام آباد: انجمن شمرقیہ علمیہ، طبع دوم، ۱۹۹۴ء

3. Wright,Sue Ellen,Lexicography, Termnet News, Vienna, No.45/1994.P:12 4. Riggs, F.U.(1989). Terminology and Lexicography: Their Complimentarity,"International Journal of Lexicography," 2(2) PP=89-110, in Sonneveld, Helmi B. & Kurt L. Leoning, Terminology Application in Interdisciplinary Communication. Amsterdam: John Benjamin Publishing Co. 1993.

۵ مصنف کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ کتاب سنہ الف ومائۃ وثمانیہ وخمسین (۱۱۵۸ھ) کو تمام ہوئی۔ متن عیسوی کے مطابق یہ اٹھارویں صدی کا وسط ۴۵، ۱۷ء ٹھہرتا ہے ۶ دنیا میں اس کتاب کی شہرت کا اندازہ مختلف ملکوں میں شایع شدہ ایڈیشنوں سے لگایا جا سکتا ہے (۱) استنبول (ترکی) احمد جودت ۱۳۱۷ھ (نامکمل) (۲) قاہرہ (مصر) ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۹ء (نامکمل) اور پھر ۱۹۸۴ء (الگ ایڈیشن) لطفی عبدالبدیع کی تحقیق کے ساتھ (۳) بیروت (لبنان ۱۹۶۶ء (۴) تہران (ایران) ۱۹۶۷ء سے محمد پروین گنابادی کی تحقیق اور دیباچہ کے ساتھ (۵) اب ۱۹۸۹ء میں لاہور سے سہیل اکیڈمی کا ایک ایڈیشن شایع ہوا ہے، جس میں صحت الفاظ پر توجہ دی گئی ہے، ۷ کشاف اصطلاحات الفنون میں نام محمد اعلیٰ بن شیخ محمد علی بن قاضی محمد حامد درج ہے۔ مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے اپنی تصنیف قسطاس فی اثر ابن عباس میں ان کو "جدی قاضی محمد اعلیٰ تھانوی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر زبیر احمد کے حوالے سے جناب وحید اللہ صدیقی نے "محمد علی فاروقی" بھی لکھا ہے، لیکن "محمد اعلیٰ" پر اتفاق کیا ہے، تاہم آپ کے پردادا محمد صابر سے اوپر سلسلۂ نسب یوں بیان ہوا ہے،

" ملا محمد صابر بن شیخ علی کلاں بن شیخ عبداللہ بن شیخ سراج الدین قاضی چندن بن قاضی محمد موسیٰ بن قاضی نصر اللہ"

یونس معلوف نے محمد علا، اسماعیل پاشا نے محمد علی، ڈاکٹر زبیر احمد نے محمد علی فاروقی، ایڈورڈ ونڈائیک نے محمد علی بن اعلیٰ جیسے نام لکھے ہیں۔ دیکھیے نورالحسن راشد، محولہ بالا ص: ۵۶-۵۷ (وحید اللہ خاں صدیقی، قاضی محمد اعلیٰ تھانوی، "العلم"، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۹۴ء، ص: ۵۶-۵۷) ۸ وحید اللہ خاں، محولہ بالا، ص: ۵۸ ۹ یہ تاریخ پیدائش ظن و تخمین سے نکالی گئی ہے، بعض حوالوں میں اسے بیان کیا گیا ہے ۱۰ علامہ تھانوی کے عہد میں

ان کے ایک چچا زاد بھائی محمد مکرم خاں فاروقی نے فارسی زبان میں ایک تفسیر لکھی تھی جو غالباً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں تلف ہوگئی، ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی نے اردو میں تفسیری ادب کراچی (۱۹۹۴ء) میں اس کا تذکرہ (ص: ۴۹) کیا ہے ۱۱ نورالحسن راشد صاحب کے ایک بیان (ص: ۵۸) سے الجھن پیدا ہوتی ہے کہ صرف ایک قاضی ایسے مقرر ہوئے جو قاضی نصر اللہ کی اولاد میں نہیں تھے، یہ قاضی محمد حامد خلف شیخ علی تھے جو تھانیسر کے فاروقی خاندان کے ایک فرد تھے، ان کا تھانہ بھون کی قضا پر تقرر مولانا محمد صابر کی حیات میں نواب شکار خاں کے ایما پر ہوا، جناب وحید اللہ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"نہ معلوم راشد صاحب نے کس ماخذ کی بنیاد پر قاضی محمد حامد کو قاضی نصر اللہ کی اولاد سے نکال کر تھانیسر کے کسی اور فاروقی خاندان سے ملا دیا، حالانکہ قاضی محمد حامد قاضی نصر اللہ کی اولاد میں سے تھا اور خود قاضی نصر اللہ کا تعلق تھانیسر سے تھا اور وہ وہاں سے ہجرت اختیار کرکے تھانہ بھون میں آبسے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں شیخ محمد علی بن قاضی محمد حامد کی بجائے غلطی سے قاضی محمد حامد بن شیخ علی لکھا گیا ہوگا۔ اسی سے یہ سب الجھنیں پیدا ہوئیں، اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قاضی کا عہدہ شیخ عبداللہ کے بیٹوں میں سے کسی ایک بیٹے کی اولاد میں چل رہا ہوگا، ملا محمد صابر اسے اپنے خاندان میں لانا چاہتے ہوں گے۔ ان کے تین بیٹے تھے: خالد، احمد اور محمود۔ لہٰذا انھوں نے نواب شکار خاں سے جو بڑولی کے رہنے والے تھے اس خاندان کے نواسے تھے، سفارش کرا کر اپنے بیٹے محمد حامد کو قاضی کا عہدہ دلوا دیا ہوگا، جس پر وہ اپنی رحلت ۱۱۴۳ھ تک فائز رہے ہوں گے۔ نورالحسن راشد صاحب کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۴۳ھ/ مطابق ۱۷۲۵ء میں قاضی محمد حامد کے انتقال کے بعد

قاضی محی الدین تھانہ بھون کے قاضی مقرر ہوئے اور ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲ء تک اس منصب پر فائز رہے، غالباً ۱۱۴۳ھ میں نائب قاضی کے عہدے پر کوئی اور صاحب کام کر رہے ہوں گے۔" (ص ۵۸، ۵۹)

۱۲ مولانا سید عبدالحئی حسنی نزہۃ الخواطر (ج ۶، ص: ۲۰۸) میں لکھتے ہیں کہ انھیں مولانا اشرف علی تھانوی نے بتایا تھا کہ شیخ محمد اعلیٰ عہد عالمگیری میں تھانہ بھون کے عہدہ قضا پر مامور تھے (مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون میں ڈاکٹر لطفی عبداللہ (قاہرہ ۱۹۶۳ء) نے بھی اسی حوالے پر تکیہ کیا ہے، وحید اللہ خاں لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ ایک دستاویز کی تاریخ کتابت رجب ۱۱۳۷ھ/ مارچ ۱۷۲۵ء ہے، اس پر ان کے دستخط ہیں، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ وہ اسی سنہ میں اس عہدہ پر فائز ہوگئے تھے، مگر چونکہ اس کے بعد ۱۱۵۶ھ تک قاضی محمد اعلیٰ کی مصدقہ کسی اور دستاویز کا اندراج نہیں دکھائی دیتا، اس لیے یہ قیاس درست معلوم نہیں ہوتا .... ممکن ہے ان کے دادا محمد حامد ۱۱۳۷ھ میں مسند قضا پر متمکن ہوں اور اس وقت انھوں نے پوتے کی لیاقت کو آزمانے کے لیے کسی ایک دستاویز پر بحیثیت نائب قاضی ان کے دستخط کرا دیے ہوں یا انھیں اپنی معاونت کے لیے مقرر کر رکھا ہو، ان کی وفات ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۱ء میں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعد علامہ تھانوی قاضی مقرر ہوئے ہوں لیکن الٰہی بخش کاندھلوی کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا محمد حامد کی تاریخ ہے، کیونکہ اعداد ۱۱۴۳ھ نکلتے ہیں، ۱۱۹۱ھ نہیں نکلتے، قاضی محمد اعلیٰ کی قدیم ترین دستاویز بھی جمادی الاول ۱۱۶۶ھ/ مارچ

۱۷۵۳ء کی تحریر شدہ ملتی ہے"۔ (وحید اللہ خاں' محولہ بالا، ص: ۶۸)

[3] حکیم محمد عمر چھتاولی، حالات نشر محمدیہ، میرٹھ ۱۲۹۷ھ، ص ۵۶ اور ذیل صفہ از مولانا عبداللہ گنگوہی، ساڈھول، ۱۳۳۰ھ ص: ۲۰، بحوالہ نور الحسن راشد صاحب محولہ بالا، ص: ۵۸ [4] وحید اللہ خاں، محولہ بالا، ص: ۵۸ [5] احکام الاراضی ایک اور اہم کتاب ہے، اس کا ایک اقتباس دلچسپی کا باعث ہوگا، برصغیر کی زمینوں کے بارے میں شرعی احکام کی تفصیل میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی زمینیں عشری ہیں نہ خراجی، نہ زمینداروں اور کاشتکاروں کو زمین کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اراضی بیت المال کی املاک کا حصہ ہیں اور ان کے لیے بیت المال کی تعبیر موزوں ہے اور شرعی طور پر ان کا وہی حکم ہے جو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سواد عراق کا اور فقہائے حنفیہ کے یہاں سرزمین مصر کا ہے"

اس کتاب کے نسخے انجمن ترقی اردو، نیشنل میوزیم کراچی، انڈیا آفس لائبریری لندن، خدا بخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہیں۔ نور الحسن راشد نے تفصیلی تذکرہ کیا ہے، ان کے نزدیک ہارون آباد (بہادر نگر) کے مولوی عبدالخالق نے مستند نسخہ تیار کیا ہے، دیکھیے: نور الحسن راشد، محولہ بالا، ص ۶۲ اور ۷۲، ۷۴۔ (باقی)

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے

اس کتاب میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے فن تعمیر، رفاہ عام کے کام شہروں اور گاؤں کی آبادی، باغات، حیوانات، ترقی تعلیم، کاغذ سازی، کتب خانے وغیرہ کا مفصل تذکرہ اور تیموری عہد کے فن خطاطی پر شاہ معین الدین احمد مرحوم کی سیر حاصل تحریر بھی ہے

قیمت ۷۰ روپے۔

مولانا فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی نعمانیؒ

از جناب مولوی عبدالباری آسی مرحوم

مولوی عبدالباری صاحب عرصہ تک دار المصنفین میں تصحیح اور کتب خانہ کی نگرانی کی خدمت پر مامور رہے، یہاں کے علمی ماحول سے ان میں بھی لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ مختلف اخباروں اور رسالوں میں ان کے مضامین ابو علی اثری و اعظمی وغیرہ ناموں سے برابر چھپتے رہتے تھے، یہ مضمون انتقال سے چند ماہ پہلے انہوں نے دیا تھا، میں نے اس میں کسی قدر رد و بدل کے علاوہ اس کا مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ اس کے مآخذ تحریر فرما دیں۔ لیکن وہ مضمون کسی ترمیم کے بغیر صرف یہ لکھ کر کہ "ماخوذ از حیات شبلی" میری فائل میں دوبارہ رکھ گئے، دو سال پہلے اسی مہینے میں ان کی وفات ہوئی تھی اسی مناسبت سے یہ مضمون شایع کیا جا رہا ہے جو تمام تر حیات شبلی سے ماخوذ ہے۔

ع گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را "ض"

قصبہ محمد آباد گہنہ[1] کے قریب ایک گاؤں ولید پور[2] میں ایک بزرگ شاہ محمد کامل گزرے ہیں،

---

[1] مسلمان زمینداروں اور شرفاء کی ایک قدیم آبادی جو پہلے اعظم گڑھ اور اب ضلع مئو میں شامل ہے،

[2] یہ بھی مسلمان رؤسا کی بستی تھی، سر شاہ سلیمان یہیں کے رہنے والے تھے۔

جن کا مزار مرجع خلایق ہے، ان کا عرس[1] بھی دھوم دھام سے ہوتا تھا، شاہ محمد کامل تعلیم سے فراغت کے بعد ایک صاحب نسبت شخص عبد الحلیم چشتی قادری کے مرید او خلیفہ ہو گئے تھے، وہ انگریزی حکومت میں ملازم تھے اور ترقی کرکے منصف ہوگئے تھے۔

اسی ملازمت کے سلسلہ میں ان کا قیام جب شرقیوں کے دار السلطنت جونپور میں رہا تو انھوں نے سلاطین شرقیہ کے دور کی عظیم الشان سنگی جامع مسجد اٹالہ کی مرمت کرائی تھی جو ان کا ایک دینی کارنامہ ہے، اسی مسجد کے جنوبی دروازے کے باہر راستے میں ابراہیم شرقی کے دور کے مشہور عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی پختہ قبر ہے لیکن اس کی نہ چہار دیواری ہے اور نہ گنبد، ریٹائر ہونے کے بعد شاہ صاحب اپنے وطن ولید پور میں مستقل سکونت اختیار کرکے رشد و ہدایت کا کام انجام دینے لگے، مزار کے قریب ان کی شاندار حویلی اور مسجد اب تک موجود ہے۔

انہی صوفی محمد کامل کے داماد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی تھے جو عربی کے ادیب معقولات کے ماہر اور درسیات کے استاد تھے۔ یہ مولانا شبلی کے والد اور اعظم گڈھ کے

---

[1] عرس کے موقع پر قوالوں کی بہت سی ٹولیاں آتی تھیں اور اپنے نغموں سے ارباب حال کو محظوظ کرتی تھیں، لیکن ان میں سب سے ممتاز بخشا قوال تھا، وہ جب گاتا تھا تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، بلکہ بعض سامعین پر وجد بھی طاری ہو جاتا تھا، ایک نعتیہ غزل کے اس مصرع محمد محمد پکارا کروں میں کے لفظ محمد کو سو سو طریقوں سے ادا کرتا تھا جو اس کی موسیقی دانی کا کمال تھا اور اس کے اسی کمال کی بنا پر خواجہ حسن نظامی کے اہتمام میں اس کا گانا دلیسرا ئیگل لاج میں ہوا اور بہت پسند کیا گیا، اس غزل کا ایک شعر یہ ہے:

شب وصل پڑھ پڑھ کے واللیل گیسو　　وہ بکھرا کرے اور سنوارا کروں میں

مشہور وکیل شیخ حبیب اللہ صاحب کے دوست تھے، شیخ صاحب نے اور شہر کے دوسرے اہل استطاعت بزرگوں نے ملکر اعظم گڈھ میں عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس کے پہلے مدرس اعلی مولانا فیض اللہ صاحب مئوی مقرر ہوئے تھے جو مولانا سخاوت علی جونپوری کے شاگرد تھے، مولانا فاروق صاحب ان دنوں مدرسہ چشمہ رحمت غازیپور میں مدرس تھے۔ ان کی تعلیم و تدریس کی دور دور شہرت تھی، شیخ صاحب نے ان سے دوستی کی بنا پر مولانا شبلی کو مدرسۂ چشمہ رحمت غازیپور میں انہی کے پاس بھیجدیا، مولانا فاروق چریاکوٹ کے قاضی علی اکبر کے دوسرے صاحبزادے تھے، ان کے بڑے صاحبزادے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی تھے جو عربی علوم کے ساتھ عبرانی زبان کے بھی بہت بڑے عالم تھے، اور عبرانی زبان کلکتہ جاکر یہودی عالموں سے پڑھی تھی اور اس زبان پر ان کو بڑا عبور ہو گیا تھا، انھوں نے قرآن سے پہلے کے تمام آسمانی صحائف توریت، زبور، انجیل کا مطالعہ اصل عبرانی میں کیا تھا، انہی صحائف کی روشنی میں بشریٰ کے نام سے ایک ضخیم کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں لکھی ہے جو سیرت کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے، بنارس اور غازیپور کے زمانہ قیام میں ان سے سر سید علیہ الرحمہ نے بھی استفادہ کیا تھا اور توراۃ، انجیل اور زبور کے بعض مباحث کے سمجھنے میں ان سے پوری مدد لی تھی اور بعض مسائل پر ان سے رسالے بھی لکھوائے تھے۔

مولانا فاروق نے پہلے اپنے انہی بڑے بھائی مولانا عنایت رسول سے تعلیم حاصل کی، ہیئت کا فن مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی سے، فقہ کی کتابیں مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے اور منطق کی تمام متداول کتابیں مولوی ابو الحسن صاحب منطقی سے اور بعض علوم ملا نعمت اللہ فرنگی محلی سے پڑھے، یہاں تک کہ ان کو علوم معقول و منقول

ریاضیات وادبیات سب پر عبور ہوگیا، ریاضی کی ایک شاخ موسیقی بھی ہے، مولانا فاروق نے اور فنون کی طرح اس فن کو بھی اس دور کے کسی استاد سے باقاعدہ پڑھا، اور اس میں بڑی دستگاہ حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد سب سے پہلے مدرسہ چشمہ رحمت غازیپور میں مدرس ہوئے، پھر وہ شیخ حبیب اللہ صاحب کے قائم کردہ مدرسہ عربی اعظم گڈھ میں آئے، جہاں مولانا شبلی کو دوبارہ ان سے درس لینے اور پڑھنے کا موقع ملا، جب ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں دارالعلوم قائم کیا تو موصوف اس کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، اس کے بعد درس وتدریس کی خدمت ترک کرکے بلیا میں وکالت شروع کردی تھی، مولانا شبلی جب دارالعلوم کے معتمد تعلیمات مقرر ہوئے تو ان کو عربی کے ادیب اول کے عہدہ پر بلایا۔ ابھی اس عہدہ پر چند ہی روز گزرے تھے کہ یہاں مستقل رہنے کے خیال سے اپنا اسباب وسامان لینے کے لیے غازیپور گئے، پھر وہ وہاں سے واپس نہیں لوٹ سکے اور وہیں، ۲؍اکتوبر ۱۹۰۹ء میں انتقال کرگئے، جن کا مرثیہ مولانا شبلی نے غالباً فارسی میں بہت ہی پُر درد لکھا اور اس حادثہ فاجعہ کا الندوہ کے شذرات میں بھی ذکر کیا۔

مولانا فاروق صاحب کے نظم ونثر میں کئی رسالے یادگار ہیں، انہی میں ایک رسالہ تطلیقات ثلاثہ پر بھی ہے جو اب پورے ملک کا موضوع سخن بنا ہوا ہے، وہ اردو وفارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے، انہوں نے دو مسدس بھی لکھے تھے، ایک مسدس ۱۸۹۳ء کے اعظم گڈھ خصوصاً مئو کی گئو کھشی یعنی ہنگامہ گاؤکشی پر ہے، اور ایک مسدس حالی کے مشہور روزگار اور مقبول انام مسدس حالی کے جواب میں ہے، جس کا نام عوالی ہے، پہلی بیوی سے جو شاہ محمد کامل ولید پوری کی صاحبزادی تھیں،

مولانا فاروق کے دو صاحبزادے تھے، ایک شمس العلماء محمد امین صاحب، دوسرے مولانا محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹی صاحب جواہر سخن۔ یہ دونوں حضرات بھی علم وادب کے حلقہ میں اپنے نامور والد ہی کی طرح مشہور ہیں، مولانا کیفی تو ندوہ میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم درس اور کلاس فیلو بھی تھے، مولانا فاروق سے مولانا شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تلمذ کا شرف حاصل ہے، عربی ادب کی بعض کتابیں انہی سے پڑھی تھیں۔

فرنگی محل کے ایک مولانا رحمت اللہ صاحب تھے، جو چار واسطوں سے ملا قطب الدین سہالوی کے سلسلۂ اولاد میں تھے، انہوں نے اپنے چچا ملا ظہور اللہ سے تعلیم پاکر غازیپور میں قیام کیا اور اپنے نام کی نسبت سے اسی مدرسہ چشمہ رحمت کی بنیاد ڈالی اور درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔ ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی، اردو کے مشہور شاعر شمشاد فرنگی محلی لکھنوی المتوفی ۱۹۱۷ء اسی مدرسہ کے ایک استاد تھے اور فارسی زبان وادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، ان کے تلامذہ میں اعظم گڈھ کے مولانا مصطفےٰ صاحب سکروری تھے، جو مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں فارسی کے استاد تھے اور اٹھارہ ہزار فارسی کے اشعار ان کو زبانی یاد تھے، مدرسہ چشمہ رحمت غازیپور کے دوسرے مشہور اساتذہ مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری (شاگرد مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی بانی مدرسہ) تھے، ایک زمانہ میں اس مدرسہ کی بڑی دھوم تھی، مولانا شبلی کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری، مولانا عبدالسلام صاحب سیرۃ البخاری، مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعرالہند وغیرہ جیسے مشاہیر علم وادب یہاں کے طالب علم تھے، اس مدرسہ کے

ایک مدرس مولوی شبلی صاحب فقیہ جیراجپوری تھے، یہی انکو مولانا شبلی نعمانی، دارالعلوم ندوۃ العلما میں لوا گئے تھے اور وہیں اپنی پوری زندگی فقہ کے درس و تدریس میں گزار دی اور ندوہ کے تعلق کے زمانہ میں وفات بھی پائی۔

۱۹۰۱ء کے آغاز میں سید صاحبؒ اور مولوی نجم الہدیٰ دسنوی دارالعلوم ندوۃ العلما کے درجہ ابتدائی سال دوم میں داخل ہوئے تو اس وقت مولانا فاروق صاحب چریاکوٹیؒ مفتی عبداللطیف مرادآبادی اور مولانا حفیظ اللہ صاحب بندی جیسے مشاہیر اس کے تعلیمی اسٹاف میں تھے، ان میں سب سے زیادہ فائدہ انھوں نے مولانا فاروق ہی صاحب سے اٹھایا اور انہی کے دامن فیض میں ان کی آنکھیں کھلیں، سید صاحب کو ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ کچھ تو ان کے ذاتی ذوق و شوق اور زیادہ تر مولانا فاروق جیسے یگانۂ فن استاد کے فیض درس سے ان کی ادبی استعداد میں اور اضافہ ہوگیا، وہ مدرسہ کے خارج اوقات میں بھی مولانا فاروق سے استفادہ کرتے تھے اور ادب کے جو نکتے وہ بیان کرتے سید صاحب ان کو ایک کاپی میں قلم بند کر لیتے، پھر ان کو یاد کر لیتے۔ ان کے اس ذوق کو دیکھکر ان کی جانب مولانا فاروق کی خاص توجہ ہوگئی اور جس طرح انہوں نے مولانا شبلی کو بچہ شیر کا خطاب دیا تھا اسی طرح سید صاحب کو قیس کا لقب دیا تھا کہ وہ لیلائے علم کے مجنوں تھے اور ہر وقت لکھنے پڑھنے میں لگے رہتے تھے۔ دنیا کے اور کسی کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اسی شغف، اسی دلچسپی، انہماک، کثرت مطالعہ اور عشق علم و فن نے انکو مولانا شبلی جیسے دیو ہیکل عالم کا جانشین اور علامہ سید سلیمان بنا دیا، مولانا شبلی اور مولانا فاروق کے اس مشترک شاگرد کا سب سے بڑا کارنامہ دار المصنفین کو پروان چڑھانا ہے، جس کی کوئی مثال پورے ملک میں نہیں تھی، سید صاحب نے تصنیف و تالیف کا ذوق

اپنے انہی دونوں صاحب کمال استادوں سے ورثہ میں پایا تھا اور مولانا شبلی ہی کی طرح اردو کے ایک عظیم مصنف ہی نہیں مصنف گر ہو گئے۔

مولانا شبلی مولانا فاروق چریاکوٹیؒ کے آغوش پروردہ تھے، انہوں نے جو کچھ بھی نماز پورہ یا اعظم گڈھ میں اپنے والد کے زیر سایہ پڑھا انہی سے پڑھا، استاد کو اپنے اس ہونہار اور بلند اقبال شاگرد پر بڑا ناز تھا، فرماتے تھے "انا اسد و انت شبلی" میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ ہے، شاگرد کو بھی اپنے فخر روزگار استاد پر بڑا فخر تھا، جب تک زندہ رہے ان کی یاد سے غافل نہیں رہے، فرماتے تھے کہ میں نے معقولات کی کتابیں ان سے اس طرح پڑھی ہیں کہ اب کسی سے پڑھنے کی ضرورت نہیں، ان کی استادی اور شاگردی اب تک ضرب المثل ہے۔

مولانا فاروق معقولات کے ساتھ تمام علوم دینیہ میں بھی بڑے کامل تھے حنفی المسلک اور مقلد جامد تھے، انہی کے اثر اور فیض تعلیم سے مولانا شبلی بھی شروع میں متشدد حنفی تھے اور اہلحدیث کے ماننے والوں کو علانیہ گمراہ کہتے تھے، تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے گاؤں بندول آئے تو استاد کی شہ سے جیراجپور کے مشہور اہلحدیث عالم مولانا سلامت اللہ، رداں کے مولوی اسداللہ، غازیپور کے مشہور استاد حدیث حافظ عبداللہ صاحب اور دوسرے اہلحدیث علما سے قلمی مناظرے کیے، انہوں نے اپنے نام کے ساتھ امام اعظم نعمان بن ثابت کی نسبت سے نعمانی لکھنا شروع کیا، جو ان کے نام کا جزء لاینفک ہوگیا ہے، یہ اثر ان پر علی گڑھ جانے تک رہا، لیکن علی گڑھ میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور علامہ ابن حزم وغیرہ کی کتابیں ان کی نظر سے گزریں، تو آپ سے آپ ان میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں، سر سید کی صحبت کا اثر بھی ہوا، وہ

عامل بالحدیث تھے، مولانا شبلی آخر تک حنفی رہے مگر اب وقت کے بڑے بڑے اہلحدیث علماء سے بھی ان کے وسیع تعلقات ہوگئے اور مذہبی مناظرات کے بجائے تاریخ اسلام کی طرف مائل ہوگئے، اس طرح ان کی تصنیفی زندگی کا رُخ ہی بدل گیا اسلامی تاریخ اور ہندوستانی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر اتنے مضامین لکھے کہ ساری دنیا میں ان کی دھوم مچ گئی اور مورخ اسلام کی حیثیت سے مشہور ہوگئے، یہی ذوق ان کے تمام تلامذہ میں بھی پیدا ہوگیا، تاریخ و سیر و سوانح ہی ان کی زندگی کے آخر تک ان کا موضوع سخن رہے اور انہی پر داد تصنیف دیتے رہے، آخر زندگی میں سیرۃ پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم لکھنی شروع کی تھی اور اس کے دو حصے قریب قریب لکھ بھی چکے تھے کہ انکا پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا اور وہ انتقال فرما گئے اور ان کی یہ مقدس کتاب ناتمام رہ گئی اور اسکی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے، مولانا شبلی کی تصنیفی زندگی کا رُخ بدلا تو تاریخ کے کوچے سے نکل کر فن کلام کی طرف متوجہ ہوئے، مولانا روم کو دنیا بہت بڑا صوفی سمجھتی ہے اور اس حیثیت سے ان کی مثنوی میلاد کے جلسوں میں خوب دھوم دھام سے پڑھی جاتی ہے اور وہ تصوف کی ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے، لیکن مولانا شبلی نے ان کی سوانح عمری لکھی تو ان کو بجائے صوفی اور صاحب سلوک و معرفت کے متکلم اسلام کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کی مثنوی کو کلام و عقائد کی کتاب قرار دیا۔

مولانا شبلی کی طبیعت کو تصوف سے لگاؤ نہ تھا اور وہ رسوم و بدعات کے سخت خلاف تھے، مزاروں کی زیارت اور ان کے لیے شدّ رحال کو ناپسند ہی نہیں کرتے تھے بلکہ کھلی ہوئی بت پرستی سمجھتے تھے، فرماتے ہیں:

آستانوں کی زیارت کیلئے شدّ رحال — اس میں کیا شان پرستاری اصنام نہیں

اپنے استاد مولانا فاروق کی محبت ان کے دل میں زندگی کے آخری لمحہ حیات تک رہی اور علم و فضل اور شاعری میں اپنے کو انہی کا رہین منت سمجھتے رہے۔

مولانا شبلی کے خیالات میں توسع پیدا ہونے کے بعد اپنے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی کی عقیدت و محبت میں کوئی فرق نہیں آیا، انکے حادثہ پا پر جہاں انکے اور مخلصوں نے رباعیاں اور نظمیں لکھیں، جن میں اس غمناک واقعہ کی عجیب عجیب لطیف شاعرانہ توجیہیں کی گئیں ان میں سب سے زیادہ فخر کے قابل مولانا کے استاد اور مربی مولانا فاروق کی فارسی مثنوی ہے، انھوں نے اس میں بڑے پیار و محبت سے اپنے شاگرد کی بیمار پرسی کی ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں:

اے دل افروز شمع علم و ہنر — نور چشم جہاں و جانِ پدر

من شنیدم کہ اندریں پرکار — گشتی از دستِ روزگار فگار

آفتِ ناگہاں رسید بہ پائے — پائے آں رہ نوردِ جہاں پیمائے

تیرے از چند خود پسند رسید — شبلی ات را بہ پا گزند رسید

ایں خبر چوں بگوش من برسید — تاب بشنفتنش زمن برمید

آوخ آں پائے راہ پیمائے — بسوئے طیبہ گام فرسائے

ہم رہ مصر و شام و روم بدید — حیف از ساق خود جدا گردید

دل بجوش آمدم بہ نوحہ گری — باد چوں آید از تو رہ سپری

گرچہ پایت ز ساق گشتہ جدا — لیک صبرت چو کوہ پا برجا

اے خداوند واہب اعمار

دائمش بر رہ سعادت دار

مولانا شبلی نے سب سے زیادہ انکا اثر قبول کیا اور ساری عمر ان کے احسانمند رہے،

مولانا فاروق کے اور بھی بہت سے تلامذہ رہے ہوں گے، لیکن سب سے زیادہ شہرت ایک شاگرد کی حیثیت سے مولانا شبلی ہی کو حاصل ہوئی اور مولانا شبلی ہی کی نسبت سے خود مولانا فاروق کو بھی شہرت حاصل ہے جس سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا، یہ نسبت اگر ان کے ساتھ نہ ہوتی تو جس طرح اور علمائے چریاکوٹ یاد کیے جاتے ہیں اسی طرح یہ بھی یاد کیے جاتے اور اسی سلسلہ میں ان کے سوانح، حالات اور کارنامۂ زندگی لکھے جاتے، مگر جہاں مولانا شبلی کا نام آتا ہے، مولانا فاروق کا نام ضرور آتا ہے، گویا استاد و شاگرد دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایک کا نام لیتے ہی بے اختیار دوسرے کا نام ضرور آجاتا ہے، جس طرح سے امام ابی یوسف، امام محمد شیبانی اور امام زفر کا نام لیتے ہی ان کے استاد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام آجاتا ہے، دارالعلوم دیوبند فقہ حنفی کی درسگاہ ہے، لیکن آج تک فقہ حنفی کے بانی امام اعظم کی جامع سوانح عمری وہاں سے شایع نہیں ہوئی، یہ فرض کفایہ مولانا شبلی نے تیس ۳۰ برس کی عمر میں ادا کر دیا تھا۔

حیات شبلی (مرتبہ مولانا سید سلیمان ندویؒ)

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ ان کے دور کے ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ بھی ہے، اس کے شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت اس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لے کر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ یعنی موجودہ اترپردیش کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے جمع کیا گیا ہے اور اکابر علما کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے گئے ہیں۔

قیمت ۱۰ روپے

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز کا عربی کلام

از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، بریلی

(۲)

(۱۶)

یاعلی اللہ عونا یاعلی

بالتفات منک ھے تجلی

(۱۷)

یاعلی اللہ عونا یاعلی

بالتفات منک ھے تجلی

(۱۸)

یاعلی اللہ عونا یاعلی

بالتفات منک ھے تجلی

بالتفات منک ھمی تنجلی

تمہاری ذرا سی توجہ میں تمام غم بیڑے دور ہوتے ہیں

خمسہ

تضمین جناب شاہ نیاز بے نیاز علیہ الرحمۃ بر غزل امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

رب فرج قلبی و اکشف الغم النفیس

انت لی فی الدین والدنیا وکیلی والکفیل

انت تواب رؤف لیس لک مثل عدیل

خذ بلطفک یا الٰہی من لہ زاد قلیل

مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

انہ عبد الیم انت تواب رحیم

قلبہ قلب سقیم ھب لہ القلب السلیم

حزنہ حزن الیم فادفع الحزن الالیم

ذنبہ ذنب عظیم فاغفر الذنب العظیم

انہ شخص غریب مذنب عبد ذلیل

ضاع عمرہ فی ھوی نفس و فی لعب و لھو

منہ سوء بعد سوء منک محو بعد محو

منہ ذنب بعد ذنب منک عفو بعد عفو

منہ عصیان و نسیان و سھو بعد سھو

منک احسان و فضل بعد اعطا الجزیل

كل وقت في هواء النفس لي جهد وجد

ليس من جنبي لابليس الشقي دفع ورد

لي خطيات كبار ما لها حصر وعد

يا الهي لي ذنوب مثل رمل لا تعد

فاعف عني كل ذنب واصفح الصفح الجميل

لا تخيبني بقهرك اذ تمنيت اللقا

ان اقل لك رب ارني لا تقل لن ترني

باحترام في حضورك للنبي المصطفى

كن لنار ابردي يا ربي في حقي كما

قلت قلنا نار كوني انت في حق الخليل

انت غفار واني عبدك العاصي الاثيم

ربني يا رب في الدنيا باحسان عميم

القني باللطف في العقبى بجنات نعيم

رب هب لي كنز فضل انت وهاب كريم

انني ما في ضميري ربي خير الدليل

ان توب الله مفتاح لابواب الفتوح

انت يا امي غريب تب اليه كالنصوح

كل من هو جاء في الدنيا الى العقبى يروح

اين موسى اين عيسى اين يحيى اين نوح

انت يا صديق عاصي تب الى المولى الجليل

انت قیوم قدیم قادر منات الظهور

انت دیهور و دیار و باق فی الدهور

انت ماح للخطایا انت ناف للشرور

انت شاف انت کاف فی مهمات الامور

انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل

رب انظر حالتی و ارحم بفضلک یا نعم

لا تخیب راجیا من عند بابک اذ سأل

ضاع عمری فی هوی نفس و فی طول الامل

کیف حالی یا الٰهی لیس لی خیر العمل

سوء اعمالی کثیرا زاد طاعاتی قلیل

غصت فی یم الخطایا رب فانظر حالتی

کربتی قد اهلکتنی فافرج کربتی

حوبتی قد خربتنی فامح عنی حوبتی

واشف عنی کل داء واقض عنی حاجتی

ارث لی قلب سقیم انت من یشفی العلیل

انت مولانا نصیر انت حسب انت کاف

منک عفوا ارتجی یا رب فاجعلنا معاف

یا لطیف الطف بنا لا تخزنا یوم المصاف

هب لنا ملکا کبیرا نجنا مما نخاف

ربنا اذ انت قاض و المنادی جبرئیل

معارف کی ڈاک

نامۂ غم

سنگھوئی ۔ جہلم (پاکستان)

۲۶ اپریل ۱۹۹۵ء

مخدوم و محترم جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

حالات کچھ ایسے رہے کہ میں آپ کو ایک عرصہ دراز سے خط نہ لکھ سکا !

میرے چھوٹے بھائی عشرت اقبال کو ایک ظالم انسان نے قتل کر دیا تھا، یہ میرا بھائی انتہائی پاکیزہ فطرت اور وفا شعار تھا، میری والدہ محترمہ بھائی کے قتل کے بعد غالباً چھ ماہ زندہ رہیں اور وہ بھی ہم سے جدا ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

ہمارا گھرانا اللہ کے فضل و کرم سے اپنی بستی میں ایک باوقار گھرانا ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔ اب تقدیر پر کون بحث کرے، قتل کا مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے، دعا فرمائیں کہ ظالم کو اس کے کیے کی سزا ملے۔

معارف کے ذریعے آپ کے والد محترم کے انتقال کی خبر پڑھی تھی، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ سکون نصیب فرمائے، آمین ثم آمین

معارف باقاعدگی سے مل رہا ہے اور اس کا وقار قائم ہے، یہ درحقیقت دارالمصنفین کے اخلاص کا مظہر ہے، اور بھی رسائل نکلتے ہیں لیکن جتنی انسیت مجھے اس ماہنامے سے ہے اور کسی سے نہیں ہو سکی، دارالمصنفین کے ہر ہر رکن اور خصوصاً مجلس ادارت کو دل کی گہرائیوں

سے دعائیں اور سلام پہنچے۔ اہل خانہ کو دعوات صالحہ !

زندگی دکھوں سے بھر گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے صابر و شاکر بندوں میں شامل فرمائے، آمین ثم آمین۔ بعد از نماز خصوصیت کے ساتھ دعا کرنی ہوگی۔ دعاؤں اور دلی جذبات کے ساتھ ۔ خدا حافظ

مخلص : گلزار احمد

نامۂ تصحیح

کشمیری بازار ۔ آگرہ

۲۲ مئی ۹۵ء

مکرمی ! السلام علیکم

میں نے معارف میں اشاعت کے لیے ایک غزل بھیجی تھی اور اتفاقاً اس کی فوٹو کاپی اپنے پاس رکھ لی تھی، بعد میں اسے دیکھا تو ایک اچھے شعر میں ایک لفظ لکھنے میں چھوٹ گیا تھا جس سے شعر کا مطلب تو زیادہ متاثر نہ ہوتا تھا مگر وزن بہرحال باقی نہ رہتا تھا۔ بار بار سوچا کہ ایک دوسرا خط لکھ کر اس فروگزاشت کی تصحیح کر دوں مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔

بہرحال مارچ کے شمارہ میں غزل جوں کی توں شائع ہو گئی ہے اور غلطی موجود ہے، وہ شعر یہ تھا اور خط کشیدہ لفظ "جفا" شعر میں چھوٹ گیا تھا ۔

ہوتی رہے جو پرسشِ غم بھی جفا کے ساتھ
کیا خوشگوار ہو گی جفا کچھ نہ پوچھئے

والسلام

رومی مچھلی شہری

چرار شریف کا المیہ[1]

گندرپورہ، عیدگاہ۔ سرینگر

۲۳ر مئی ۱۹۹۵ء

مکرمی ومحترمی مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ! زید مجدکم ۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوں گے ۔

سانحہ چرار شریف کے بارے میں آپ نے یقیناً سب کچھ پڑھا اور سنا ہوگا ۔ یہ کشمیر کے اسلامی دور کی تاریخ کا ایک نہایت ہی دلدوز حادثہ ہے ، جس نے یہاں کے ہر شخص کو سوگوار اور ہر گھر کو ماتم کدہ بنا دیا ۔

تبکی الحنیفیة البیضاء من اسفٍ کما بکی لفراق الالف هیمان

حضرت شیخ نورالدین رشی کشمیریؒ (ولادت ۱۳۷۷ء، وفات ۱۴۳۸ء) وادی کشمیر کی جلیل القدر شخصیتوں میں ایک تھے ، جن کی شہرت اگرچہ وادی کے حدود تک ہی محدود ہے مگر وہ اپنی اصلاحی خدمات ، روحانی علو اور زہد و تقوی میں اپنے سربرآوردہ معاصرین سے کم نہیں تھے ، برصغیر کے تذکرہ نگاروں نے اگرچہ ان کے ساتھ اعتنا نہیں کیا ہے ، تاہم اسرار الابرار کے مولف علامہ داؤد مشکوتی محدث نے (م ۱۰۹۷ھ) اپنی تالیف میں ان کی شخصیت اور روحانی کمالات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس کتاب کا نسخہ دار المصنفین میں ضرور موجود ہوگا کیونکہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے بعض مقالات میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے[2] نیز مولانا آزادؔ مولانا عبدالحی صاحب حسنی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی محدث کے پیش نظر بھی یہ کتاب رہی ہے ، غرض حضرت شیخ نورالدینؒ کا تعلق اس دور کے ساتھ تھا ، جب کشمیر میں اسلام بڑی سرعت کے ساتھ پھیل رہا تھا ۔ وہ حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ہمعصر تھے اور ان کے ایک قرابتدار حضرت سید حسین سمنانیؒ کے گہرے ارادتمند تھے ، حضرت سید علی ہمدانی کے انتقال کے کچھ مدت بعد ان کے جواں سال فرزند حضرت میر سید محمد ہمدانی اپنے والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق اشاعت اسلام کی غرض سے کشمیر وارد ہوئے تو جہاں سلطان سکندر شاہ کشمیری نے ان کا خیر مقدم کیا تھا وہاں شیخ نورالدین رشی بھی خوش آمدید کہنے والوں میں پیش پیش تھے ، گو حضرت شیخ عمر کے اعتبار سے اس وقت میر سید محمد ہمدانی کے مقابلے میں پیری کے حدود میں داخل ہوچکے تھے ، مگر سلسلۂ ہمدانیہ کبرویہ کے اس نوجوان شیخ طریقت اور عالم دین سے کھل کر استفادہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ، کشمیر کی مخصوص ریشیت اس وقت تک مختلف مذاہب وادیان کا ملغوبہ تھی اور حضرت شیخ سادات مبلغین کی ملاقات سے قبل اسی کے علمبردار تھے ، مگر نو وارد مبلغین اسلام سے ملاقات کے بعد انھوں نے باقاعدہ طور پر سلسلۂ کبرویہ میں شامل ہوکر ریشیت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ، انہوں نے خود ہی ریشیت کے نامناسب اثرات کی نشاندہی کی اور زندگی کی آخری سانس تک ان کے خلاف آواز اٹھائی ، یہاں تک کہ ان کی زندگی ہی میں کشمیری ریشیت دو مستقل حصوں اسلامی ریشیت اور غیر اسلامی ریشیت میں تقسیم ہوئی اور حضرت شیخؒ اسلامی ریشیت کے مبلغ اور مقتدی ہوئے ، حضرت شیخ ایک جلیل القدر روحانی بزرگ کی حیثیت سے ہی ممتاز نہیں ہوئے بلکہ اپنے عہد کی کشمیری زبان کے ایک عبقری شاعر تھے ۔ میر سید محمد ہمدانی نے اپنی تبلیغی کوششوں کو بار آور ثابت کرنے

---

[1] یہ دونوں خطوط لکھے جا چکے تھے کہ یہ خط ملا ۔ معارف : جی ہاں قلمی نسخہ موجود ہے اور حضرت سید صاحب نے

[2] اپنے مقالہ "ہندوستان میں علم حدیث" میں اس کا ذکر کیا ہے ۔

کے لیے حضرت شیخ کی شاعرانہ صلاحیت سے مکمل فائدہ اٹھایا، جہاں عربی اور فارسی کے ضخیم دفاتر ساتھ نہیں دے سکتے تھے وہاں حضرت شیخ کے معنی آفریں ہلکے پھلکے اشعار اور سحر آفریں رباعیات نے عظیم الشان فائدہ پہنچایا، چونکہ حضرت شیخ اخلاص اور تقویٰ کے پیکر تھے اس لیے انکے اشعار بھی از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق پچھلے چھ سو سال سے کشمیر کے باشندوں کے لیے قرآن حکیم کی ایک مستقل تفسیر کی حیثیت رکھتے ہیں، اگرچہ انکی زندگی آخری دم تک فقر و درویشی کی حالت میں گزری تاہم وقت کے ارباب علم و تقویٰ اور سلاطین و امراء کے قلب و نگاہ میں بڑی وقعت رکھتے تھے، سلطان زین العابدین نے خود ان کے جنازے کو کندھا دیا تھا اور نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ اسی طرح ہر دور کے مقتدر علماء اور روحانی پیشواؤں نے انکی عظمت و بزرگی کا اعتراف کیا ہے، عہد مغلیہ کے سرکردہ عالم اور روحانی بزرگ میر حبیب اللہ نوشہروی (مرید و مجاز حضرت شیخ یعقوب صرفی) جو اپنے مرشد (شیخ صرفی) کے بعد بہت کم دوسروں کو خاطر میں لاتے تھے، حضرت شیخ نورالدین رشیؒ کے معترف ہیں ؎

نورالدین رشی است مرد بادشاہ ریشیاں　　اندریں کشمیر قبرش نیک دارد اشتہار

در ریاضت تا نیش نامد کسی در ملک ما　　چو نشان باطنش اندر کلام خوشگوار

سلطان زین العابدین نے ہی انکی آخری خوابگاہ کے متصل ایک خانقاہ تعمیر کروائی تھی جو یعقوب شاہ چک کے عہد حکومت میں نذر آتش ہو کر دوبارہ اسی عہد میں تعمیر ہوئی تھی یعقوب کی یہ یادگار ۱۷۲۶ء میں ایک بار پھر آگ ہی کے حادثہ میں تباہ ہوئی، پھر اس وقت کشمیر کے دو سربرآوردہ بزرگوں خواجہ نظام الدین درابو اور خواجہ محمود نے یہ خانقاہ از سر نو تعمیر کی، اس طرح یہ تاریخی جگہ پچھلے چھ سو سال میں تین مرتبہ آگ کی زد میں آئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے دو بار حادثاتی طور پر اور آج جان بوجھ کر کسی گھناؤنی سازش کے تحت!! بس افسوس اسی کا ہے

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد　　ان کان فی القلب اسلام و ایمان

غرض موجودہ حادثہ مستقبل میں کشمیر کے نہایت ہی تاریک واقعہ کی حیثیت سے یاد کیا جائیگا، کیونکہ یہ بدتمیزی اور گستاخی ایک ایسے بزرگ کے ساتھ کی گئی جو زہد و تقویٰ اور خلوص و ایثار کا مجسم، معاشرے کا بلند پایہ مصلح اور ہر طبقے کا ہمدرد اور غمگسار تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں سنت نبویؐ کے عین مطابق چند سیر خوراک پر قناعت کی مگر بنی نوع انسان کی خدمت اور راحت رسانی کے لیے نہ معلوم کتنے ہزار میوہ دار درخت اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوں گے، پیٹ پر پتھر باندھ کر بیسیوں کوئیں کھود دے ہوں گے، مسجدوں، حماموں غسل خانوں اور مسافر خانوں کی تعمیر و تجدید کی ہوگی، نیز کتنے راہزنوں، لٹیروں اور گمراہوں کو اپنی پرخلوص کوششوں سے راہ راست پر لاکر انسان اور انسانیت کی خدمت کی راہ پر لگایا ہوگا۔ ایسے ہر دلعزیز اور قابل احترام بزرگ کو چھیڑنا اور ان کی خوابگاہ کو جان بوجھ کر تودہ خاک میں تبدیل کرنا قانون قدرت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ ماضی میں بھی جب کسی نے اس قسم کا عمل دکھایا تو اسے دیر سویر اس کا ردعمل بھی دیکھنا پڑا۔ شاید موجودہ سرکار کے لیے یہ واقعہ ایک کڑی آزمائش کا باعث بن سکتا ہے۔ اگر مرکزی ارباب اقتدار اپنے دعوائے بے گناہی میں سچے ہیں تو انہیں اصلی مجرم کی نقاب کشائی کرنی چاہیے اور یہ نوشتۂ دیوار پڑھنا چاہیے ؎

بندہ ام را عاملت بر سر زدہ مست　　بر متاع جان خود اخگر زدہ ست

باز گیر ایں عامل بد گوہرے　　ورنہ بخشم ملک تو با دیگرے

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ والسلام

محمد فاروق بخاری

باب التقریظ والانتقاد

ظفر الامانی فی مختصر الجرجانی

تحقیق وتعلیق: ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۰۵، مجلد۔ قیمت تحریر نہیں، پتے (۱) جامعہ اسلامیہ مظفر پور، ڈاکخانہ قلندر پور، ضلع اعظم گڈھ (۲) دار القلم۔ دبی۔ امارات عربیہ۔

ڈاکٹر مولانا تقی الدین ندوی کی حدیث اور اس کے متعلقات پر اچھی نظر ہے، رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد ہی سے وہ حدیث نبوی کی خدمت میں مشغول ہیں، پہلے ہندوستان کے مدارس کو ان سے فیض پہونچا اور اب جامعۃ العین کے بام و در ان کی صدائے قال الرسول سے گونج رہے ہیں، لیکن مولانا کی خدمت حدیث کا دائرہ صرف اس کے درس و تدریس تک محدود نہیں ہے بلکہ حدیث کے مہمات کی بحث و تحقیق اور اس کے حقائق و مطالب کی تلاش و جستجو میں وہ برابر سرگرداں رہتے ہیں، درسیات اور دوسرے گوناگوں اشغال کے باوجود وہ تصنیف و تالیف میں برابر منہمک رہتے ہیں، جس کا انہیں اچھا سلیقہ اور وسیع تجربہ ہے۔ شروع ہی سے احادیث اور ان کے متعلقات پر ان کے مضامین اور کتابیں چھپتی رہی ہیں، کتب حدیث کے متون و شروح کی تحقیق و تدوین سے انہیں زیادہ دلچسپی ہے اور وہ متعدد علمائے محققین کی کتابوں کے محقق اڈیشن شائع کر چکے ہیں۔

ان کے صحیح اور بلند پایہ مذاق کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی اور ان کی تصنیفات کو اپنا مرکز توجہ بنایا ہے جو ہندوستان کے علمائے متاخرین کے سرخیل

اور علمی جامعیت و تبحر کے لحاظ سے متقدمین علمائے اسلام کے ہم پایہ ہیں، ابھی دو برس پہلے وہ مولانا فرنگی محلی کی تصنیف التعلیق الممجد کو جو موطا امام محمد کی اہم شرح ہے، اپنے حواشی و تعلیقات سے مزین کر کے شایع کر چکے ہیں اور اب انہوں نے اصول حدیث میں مولانا کی اس مایہ ناز تصنیف کی طرف اعتنا کر کے اس کا یہ خوبصورت محقق اڈیشن شائع کیا ہے، فجزاہ اللہ خیر الجزا۔

یہ کتاب سید شریف علی جرجانی کے ایک مفید مگر مختصر رسالہ کی سیر حاصل شرح اور مولانا عبد الحیؒ صاحب کی حدیث و رجال میں ژرف نگاہی کا نمونہ ہے، یہ شرح گو شائع ہو چکی ہے مگر اس کے صحیح اور محقق اڈیشن کی شدید ضرورت تھی، جس کو مولانا تقی الدین صاحب نے کما حقہ انجام دیا ہے، شروع میں مختصر مگر پُر مغز مقدمہ کے علاوہ مصنف و شارح کے حالات اور ظفر الامانی کی اہمیت و خصوصیت واضح کر کے اسے تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت بیان کی ہے، جس کی ترغیب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی دلائی تھی، ان کی قیمتی تحریر بھی اس اڈیشن کی زینت ہے۔

فاضل محقق نے کتاب کے مطبوعہ و مخطوطہ نسخوں کے فرق و اختلاف کی تصریح کی ہے اور مخطوطہ ہی کو اصل و بنیاد بنایا ہے، مصادر و مراجع کی تخریج کر کے کتاب کی تصحیح پر پوری توجہ دی ہے اور شارح کے متفرق حواشی و تعلیقات کو ان کی اصلی جگہ پر درج کر دیا ہے۔ شرح میں وارد اشخاص و مقامات کے متعلق مختصر مگر ضروری معلومات تحریر کر کے کتاب کا پایہ بڑھا دیا ہے، آخر میں پانچ فہرستیں دی ہیں، جن سے کتاب کے مطالب سے استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس تحقیق و تحشیہ اور از سر نو تدوین سے کتاب نئے قالب میں تبدیل اور "اپٹوڈیٹ" ہو گئی ہے۔

نیا دور (اودھ نمبر حصہ دوم)

مرتبہ جناب سید امجد حسین، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مع خوبصورت ٹائٹل قیمت ۱۰ روپے، پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن وپبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ اترپردیش لکھنؤ

اردو ماہنامہ نیا دور کی شہرت ومقبولیت میں اس کے "خاص نمبروں" کو بڑا دخل ہے، حال ہی میں اس کا "اودھ نمبر" بڑی آب وتاب سے شایع ہوا ہے، جو اودھ کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز ہے، اسکے پہلے حصے پر چند ماہ قبل ریویو شایع ہو چکا ہے، اب اودھ نمبر کا دوسرا حصہ شایع ہوا ہے، یہ اودھ کی گزشتہ علمی، تعلیمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا شاندار مرقع اور بہت دلچسپ ہے، شروع میں پیغام اور انٹرویو دیے گئے ہیں، پھر اردو ادب کے میر کارواں پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی علمی اور مشہور صاحب علم وقلم علی جواد زیدی نے اپنی طالب علمی کے زمانے کی لکھنؤ یونیورسٹی کے جس علمی وتعلیمی ماحول اور باوقار اساتذہ کا حال تحریر کیا ہے، وہ آج سے کتنا مختلف ہے، یہ دونوں مضامین لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ وطلبہ اور قرۃ العین حیدر کا مضمون لکھنؤ کے شہریوں کے لیے درس عبرت ہے، دوسرے مضامین بھی تحقیق ومحنت سے لکھے گئے اور پُر از معلومات ہیں، جیسے داستان امیر حمزہ (شمس الرحمن فاروقی)، اودھ میں فن سپہ گری (نیر مسعود) اودھ میں عزاداری (جعفر رضا) اودھ جغرافیائی اور تہذیبی پس منظر (محمود الحسن) اودھ میں ادبی صناعی (مجاور حسین) اودھ کے چند نامور تاریخ نگار (سبط محمد نقوی)، لکھنؤ کا گم شدہ دسترخوان (حسن واصف عثمانی) لکھنؤ کے تفریحی مشاغل (وقار ناصری) وغیرہ اودھ کے دوسرے طبقوں پر بھی مضامین ہیں، منظومات کا حصہ بھی اچھا ہے، مختلف عمارتوں اور اشیا کی تصویروں نے اس نمبر میں چار چاند لگا دیا ہے، ایسے خوبصورت، خوشنما اور معلومات افزا نمبر کی اشاعت ایک علمی وتاریخی کارنامہ ہے، جس کے لیے مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

اردو اصطلاحات سازی

از جناب ڈاکٹر عطش درانی

متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت بہترین، مجلد، صفحات ۷۶۵، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: انجمن شرقیہ علمیہ ۱۵ جی ۹/۱، ۱ اسلام آباد، پاکستان۔

لسانیات میں وضع اصطلاحات کا فن وسعت وتنوع کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے مگر یہ لفظ ومعنی کے نازک رشتہ کے گہرے علم اور فہم کا متقاضی بھی ہے، اردو زبان کی ابتدا ہی سے وضع اصطلاحات کا عمل بھی شروع ہوا، لیکن ابھی تک اس کا مکمل جائزہ نہیں لیا گیا تھا، زیر نظر کتاب اسی فریضہ کو انجام دینے کے لیے لکھی گئی ہے، فاضل مصنف سالہا سال سے اسی فن کی تحقیق وتدقیق میں مصروف ہیں اور اسوقت وہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے دارالترجمہ کے سربراہ ہیں، فن اصطلاحات سازی پر وہ تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند بھی حاصل کر چکے ہیں، یہ کتاب اصلاً انکے تحقیقی مقالہ کی نکھری اور ستھری شکل ہے، جس کے چار حصوں کے سولہ (۱۶) ابواب میں الگ الگ عنوانات کے تحت سیر حاصل بحث کی گئی ہے، شروع میں انگریزی، عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ زبانوں میں اصطلاحات سازی کی تاریخ اس لیے بیان کی گئی ہے کہ ان زبانوں سے اردو کا تعلق براہ راست ہے، ایک باب میں اس علم کے اصول وضوابط بیان کرنے کے بعد اردو میں مختلف علوم وفنون کے اصطلاحی ذخیرہ کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے، بعد کے ابواب میں تاریخی لحاظ سے اس سلسلہ کی

تمام کوششوں کا مطالعہ و جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس سے اردو میں اس فن کے بتدریج ارتقائ مختلف مکاتب فکر کے فرق و اختلاف اور اس کے مسائل و مشکلات کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے، فاضل مولف کے خیال میں ابھی تک اردو میں اصطلاحات سازی اور الفاظ نگاری کو جداگانہ عمل نہیں سمجھا گیا، حالانکہ جدید علم الاصطلاح کے لحاظ سے بھی اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، ان کے تجزیے خالص علمی اور معروضی انداز کے ہیں لیکن اردو کی محبت کا فطری جذبہ کہیں کہیں غالب ہوگیا ہے مثلاً انہوں نے اردو کو لسان الارض کہا ہے، دلیل یہ دی ہے کہ اردو کا خمیر دنیا بھر کی زبانوں سے مل کر اٹھا ہے، ایک جگہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ جدید علم الاصطلاح کی روسے دنیا بھر میں سب سے پہلے باقاعدہ اصطلاحات سازی کی مجلسوں کا انعقاد اور اصول وضع کا آغاز اردو میں ہوا، تاہم ان باتوں کو انہوں نے بلادلیل نہیں لکھا ہے، یہ کتاب مصنف کی محنت و مطالعہ اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے، اس میں مستقبل کے لیے بعض تجویزیں بھی پیش کی گئی ہیں اور بعض بنیادی نکات کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے، جیسے "دراصل اصطلاح کو قاعدے اور علمی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے اس کا استعمال اسے آسان اور مانوس بنادیتا ہے" فاضل مولف اس قابل قدر کتاب کے لیے شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں۔

نگاہ فقر از پروفیسر خلیق احمد نظامی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: ادارۂ ادبیات دلی، دہلی۔

خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد میں بڑی برکت ہوئی، اس کی وجہ سے فریدی

خاندان کا سلسلہ اور فیض دونوں وسیع اور عام ہوئے اور اس میں ایسے لائق و فائق اخلاف ہوئے جنھوں نے خاندان کے نام نیک میں اضافہ کیا، خود فاضل مصنف جو ملک کے بہت ممتاز مورخ ہیں اسی عقد ثمین کے درتابدار ہیں، زیر نظر کتاب میں انہوں نے اپنے خاندان کی علمی اور روحانی تاریخ و روایت کی داستان اس لیے قلمبند کی ہے کہ خاندانوں کی تاریخ چھوٹے پیمانہ پر قوموں کی تاریخ ہوتی ہے، اسی جذبہ سے انہوں نے آئینہ ایام میں اپنی خاندانی تصویر دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے، یہ کتاب اسی منصوبہ کی تین کتابوں کا پہلا حصہ ہے، اس کا پہلا باب خواجہ گنج شکرؒ کے کے سوانح پر مشتمل اور بقیہ ابواب میں ان کی اولاد کی ایک شاخ کے بعض بزرگوں کا ذکر ہے، ان میں فاضل مولف کے پردادا شیخ ارشاد علی چشتی اور ان کے بھائی مولوی بشیر احمد فاروقی بھی شامل ہیں، اس تذکرہ میں وہی لذت و حلاوت ہے جو خواجہ گنج شکرؒ کے ساتھ خاص ہے، اس کتاب سے اس عہد کے عام حالات و واقعات طرز معاشرت و معیشت سے بھی واقفیت ہوجاتی ہے، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ اور خواجہ حسن ثانی نظامی کی تعارفی تحریر بھی ہے، امید ہے کہ اس سلسلہ کے دونوں حصے فقر غیور اور متاع فقیر بھی جلد طبع ہوں گے۔ فقر کے اس جوہر مشترک کا اظہار شعوری طور پر کیا گیا ہے کہ فریدی خاندان کے جدامجد کے سوانح کا یہ سب سے نمایاں عنصر ہے۔

تاریخ نگاری، قدیم و جدید رجحانات از جناب ڈاکٹر سید جمال الدین متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۱۵۶، قیمت ۵۱ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

فن تاریخ نگاری پر اس کتاب میں نو مضامین ہیں جن میں بعض اہم اور قدیم
علمائے تاریخ جیسے ہیروڈوٹس، تھیوسیڈڈیز، پولیبس اور ابن خلدون کے فلسفہ اور
نظریۂ تاریخ کے جائزے کے ساتھ باشم، محمد حسین آزاد، پروفیسر محمد مجیب اور
سید صباح الدین عبدالرحمن جیسے جدید مورخوں کے نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور
بتایا گیا ہے کہ تاریخ نگاری میں خود مورخ کے ذوق و رجحان کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے
لائق مولف نے موخر الذکر تینوں ہندوستانی مورخوں کے مطالعہ میں ایک قدر
مشترک کی نشاندہی کرکے بتایا ہے کہ انہوں نے تاریخ کی اصل روح تلاش کرنے کی
کوشش کی ہے اور وہ روح انہیں تہذیبی سرمایہ میں نظر آئی، سید صباح الدین
عبدالرحمن کی تاریخ نویسی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ اصلاً دبستان شبلی کی تاریخ نگاری
کا نمایاں باب ہے جس کی خصوصیات مقصدیت، رومانیت، عصری آگہی اور تاریخی شعور
میں باہمی ربط، سادہ واقعہ نگاری اور اسباب و علل کے اصول کی پیروی وغیرہ ہیں'
محمد حسین آزاد کی دربار اکبری کا تجزیہ دلچسپ ہے، یونانی اور مغربی مورخین کے متعلق
ان کی تحریریں معلومات افزا ہیں، اردو میں تاریخوں کی کثرت کے باوجود فن تاریخ نگاری
پر عمدہ کتابیں کم ہیں، یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے میں مفید و معین ہوگی۔

طلاق ثلاثہ اور حافظ ابن القیم از جناب مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۱۰۶، قیمت ۳۵ روپے،

پتہ: الفرقان بکڈپو نظیر آباد، لکھنؤ۔ یوپی۔

طلاق ثلاثہ کی بحث پرانی اور پامال ہونے کے باوجود موجودہ دور میں فقیہوں
سے زیادہ صحافیوں اور سیاستدانوں کا مرغوب موضوع ہوگئی ہے، بحث و تکرار کی

اس گرم بازاری میں قرآن و سنت اور شریعت کی روح سے زیادہ اب ذاتی خیالات
اور پسند و ناپسند کی کارفرمائی نظر آتی ہے، مگر اس نئی کتاب میں خلوص کے جذبہ سے
اس موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں
کو ایک ہی طلاق قرار دینے والے علامہ ابن القیم کے خیالات کا تجزیہ کرکے یہ بتایا
گیا ہے کہ وہ قطعی طور پر اپنے اس عام اور مشہور موقف و مسلک کو ترک کرکے
مذہب جمہور کے قائل ہوگئے تھے، لیکن آگے یہ بھی لکھا گیا کہ "گو علامہ ابن القیم نے
صاف طور سے ہرگز یہ بات نہیں کہی ہے کہ وہ اپنے مشہور موقف سے دستبردار
ہوتے ہیں" اس سے فاضل مولف کی قطعیت کا دعویٰ کمزور ہوجاتا ہے۔ علامہ ابن القیم
کے رویہ کی توجیہ کرنے میں مولانا سنبھلی کو بعض سخت اور شاید ناگزیر مقامات سے
گزرنا بھی پڑا ہے لیکن اتنا تو ہوا کہ بعض نئے اور اہم پہلو سامنے آگئے جن میں اس
موضوع سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے سامان غور و فکر ہے۔

سبزۂ معنی بیگانہ از جناب فضا ابن فیضی، متوسط تقطیع، بہترین
کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۲۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مجمع البحوث
العلمیۃ الاسلامیہ، ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر ۴۔ جوگا بائی،
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

جناب فضا ابن فیضی کی شخصیت اور شاعری محتاج تعارف نہیں، ان کی
قادر الکلامی، فن کی پختگی و مشاقی اور زود گوئی کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ زیر نظر
کتاب ان کا چھٹا شعری مجموعہ ہے، کلام کی بلند پائیگی، معنویت اور قدیم و جدید کے
پیمانوں کی جامعیت و ندرت کے لحاظ سے یہ گویا آئینہ شش جہات ہے، غزل کی

دیرینہ روایات کو انہوں نے جدید رنگ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے، مشکل و سخت ردیف و قوافی اور تنگ زمینوں میں بھی انہوں نے کمال ہنر سے ایک چمن سجا دیا ہے، اس مجموعہ کی پہلی غزل میں انہوں نے لامکاں، سائباں، بادباں کے ساتھ ہندی لفظ سمان کو کس خوبصورتی سے سمویا ہے:

میں جوئے کم آب، مجھ سے لیکن — سلوک دریا سمان اس کا

اسی غزل کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

ہے جس سے لوحِ حرا مزین — وہ نقش مرسل بیان اس کا

اسلوب و تعبیر کی جدت بھی ملاحظہ ہو:

کوئی گلاب نیا میری شاخ جاں پہ کھلا — کفِ گلاب کو پھر خار شادمانی دے

کیا شوخیٔ موسم تھی کہ خوشبوئے حرا کو — محدود، جوار ابوطالب میں نہ رکھا

کتابت و طباعت نہایت خوبصورت ہے لیکن سرورق پر "سبزۂ معنی بیگانہ میں" کے بجائے "ہیں" کا سہو سرزد ہوگیا ہے۔

جغرافیہ جدید ضلع اعظم گڈھ

از جناب مفتی عبدالقادر بستوی، صفحات ۶۴، قیمت ۸ روپے، پتہ: مدرسہ عربیہ قاسم العلوم، منگراواں، ضلع اعظم گڈھ۔ یوپی۔

مکاتب اور پرائمری اسکول کے بچوں کے لیے آسان زبان میں اعظم گڈھ کا جغرافیہ ہے پہلے مئو اعظم گڈھ ضلع میں شامل تھا، اب وہ خود ضلع ہوگیا ہے اور اعظم گڈھ کمشنری بن چکا ہے اس لیے اس کے ایک جدید جغرافیہ کی ضرورت تھی اس کتاب نے خوبی سے اس ضرورت کو پورا کردیا اور زیادہ خوشی اس کی ہے کہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے۔

ع۔ص